حصہ چہارم

تعلقات

بندے اور خدا کا تعلق

اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کی اور اسے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔یعنی انسان اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی وہ مخلوق ہے جو اس کی سب مخلوقات سے افضل ہے۔

ایک تخلیق کار مثال کے طور پر ایک مصور ہی لے لیں صرف وہی اصل میں سمجھ سکتا ہے کہ اپنے ہاتھ، ذہن اور دل کے گہرے جذبے سے بنائی ہوئی تخلیق خالق کو کتنی پیاری عزیز ہوتی ہے۔اسی طرح بندے اور خالق کا تعلق بھی بہت انوکھا بہت پیارا ہے۔اللہ تعالیٰ نے بڑے پیار، بڑے جذبے اور بڑی محبت سے انسان کو بنایا ہے اور اس میں جان ڈالی ہے۔

انسان کو پیدا کرنے سے پہلے ہی خدا نے اس کی زندگی، تحفظ اور اس کی ہر ضرورت کا اہتمام کر کے رکھا ہوتا ہے۔ماں کی گود کی نرمی اور شفقت اس کی منتظر ہوتی ہے۔اس کی بھوک پیاس اور ہر بنیادی ضرورت کا انتظام خالق نے پہلے ہی کر کے رکھا ہوتا ہے تا کہ اس کی تخلیق کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

بندے اور خالق کا رشتہ بڑا انوکھا ہے۔ہر بندہ اپنی فرق طبیعت اور تجربے کی بنیاد پر ایک مختلف نوعیت کا تعلق رکھتا ہے۔

قرآن پاک میں آیا ہے کہ:

'' کیا وہی نہ جانے گا جس نے تمہیں پیدا کیا ہے؟ حالانکہ وہ تو باریک بین اور خبردار ہے۔ ''

(67: 14)

یعنی خدا ہمارے ایک ایک ذرے سے واقف ہے۔جتنا وہ ہمیں جانتا ہے اس سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا۔آج کے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ اپنے خالق یعنی اللہ سے دوری ہے۔اگر یہ دوری نہ ہو تو انسان کے سب دکھ، سب پریشانیاں ختم ہو جائیں۔

ہم اپنی روزمرہ زندگی میں اس قدر مگن ہو گئے ہیں، اس قدر مصروف ہو گئے ہیں کہ ہمیں فرصت ہی نہیں ہے کہ اپنے خالق کی طرف بھی متوجہ ہوں۔اس کے پیار کا حق ادا کریں۔اس سے تعلق جوڑیں۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو دلی سکون ہو، خوشی اور مسرت ہو تو کوشش کریں کہ آپ اللہ سے اپنا تعلق پہچانیں اور اس کو مزید مضبوط کریں تا کہ آپ کے سب مسائل ختم ہوں۔مندرجہ ذیل چند باتیں اس حوالے سے آپ کی مددگار

ثابت ہوں گی۔

☆ روزانہ دن میں کم از کم ایک مرتبہ دس پندرہ منٹ کے لیے خاموشی سے (ایک کمرے میں بیٹھ کر) تنہائی میں اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان دیجئے اور یہ سوچئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دیکھ رہا ہے۔ بڑے ہی پیار، نرمی اور شفقت سے وہ آپ کی طرف متوجہ ہے۔ اس سے زیادہ آپ کو کوئی اور نہیں سمجھ سکتا نہ ہی کوئی آپ کا اس سے زیادہ خیر خواہ ہے۔ یاد رکھیئے! آپ کو دنیا میں سب سے زیادہ پیار اور شفقت آپ کے ماں باپ سے ملتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات ان سے ستر گنا زیادہ آپ کو چاہتی ہے۔ اس سے بڑھ کر آپ کو کوئی نہیں پیار کر سکتا۔

جب آپ یہ تصور قائم کر لیں گے تو اللہ سے باتیں کرنا آسان ہو جائے گا۔ آپ اپنے دل کی تمام باتیں، تمام مسئلے،

☆ دکھ پریشانیاں سب کچھ اس سے کہہ ڈالیں اور یاد رکھیں کہ وہ سن رہا ہے، دیکھ رہا ہے اور سمجھ رہا ہے۔

ہم لوگ اپنے اہم مسائل کے لیے جگہ جگہ جاتے ہیں۔ طرح طرح کے لوگوں سے مسئلے کا حل پوچھتے ہیں لیکن ہم اللہ سے اپنے مسئلوں کا حل کبھی نہیں مانگتے۔ کوئی کام شروع کرنے سے پہلے ہم اس سے مشورہ نہیں کرتے۔ ہم سب کو چاہیئے کہ اپنے سب کاموں اور مسائل کے لیے اللہ سے مشورہ مانگیں کہ وہ ہمیں صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق دے۔ اس سے سوال کریں، باتیں کریں یقین جانئے وہ آپ کی سب باتیں سن رہا ہے اور ہر بات کا آپ کو جواب دے گا۔ ہر مسئلے کا حل بتائے گا۔

'' خدا تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہے۔ '' (50: 16)

اللہ پر یقین اور اعتماد کرنا سیکھئے۔ زندگی میں ہماری ناکامیوں کی سب سے بڑی وجہ ہی یہ ہے کہ ہم دعویٰ تو کرتے

☆ ہیں لیکن حقیقی معنوں میں اللہ پر بھروسہ نہیں کرتے۔ اللہ پر بھروسہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے اور صرف دعائیں کرتا رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی مقصد کے لیے آپ اپنی طرف سے پوری کوشش کریں اور اس کے بعد نتائج کے لیے اللہ پر بھروسہ کریں۔ سب معاملات اس پر چھوڑ دیں اور دل میں یقین رکھیں کہ جو کچھ بھی وہ کرے گا وہی آپ کے لیے بہتر ہوگا۔ ایسا کرنے سے آپ کی سب پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ اگر کسی کام کے نتائج آپ کی مرضی کے مطابق نہیں بھی نکلیں گے تب بھی آپ کو سکون ہی ہوگا کہ اس میں آپ کے لیے بہتری ہے کیونکہ اب یہ معاملہ صرف آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اب آپ نے اپنے اللہ کو اس سارے معاملے میں شامل کر لیا ہے۔ اب جو کچھ بھی ہوگا آپ کے حق میں بہتر ہی ہوگا۔

☆ اللہ سے پیار کرنا سیکھیں۔ اپنے دل کو ٹٹولیں کہ کیا واقعی آپ اس سے اتنا پیار کرتے ہیں جتنا کہ اس کا حق

ہے؟ اللہ سے پیار کرنے کا مطلب ہے کہ آپ کا دل اس سے راضی ہو' آپ اس سے خوش ہوں' آپ اس کے شکر گزار ہوں کہ اس نے آپ کو زندگی دی ہے اور آپ کو موقعہ دیا ہے کہ آپ اس دنیا میں آئیں اور اپنے لیے خوشیوں اور کامیابیوں کے رستے ڈھونڈیں۔

☆ اللہ سے پیار کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ دنیا میں آنے کے اصل مقصد کو پہچانیں۔ آپ سے کوئی ایسا کام نہ ہونے پائے جس سے اللہ ناراض ہو جائے۔

☆ اگر کبھی آپ سے کوئی غلطی ہو جائے تو مت بھولیے کہ خدا کی ذات نہایت شفیق ہے۔ رحمت ہی رحمت ہے۔ محبت ہی محبت ہے۔ اس نے اپنی رحمت کے بازو پوری کائنات میں پھیلائے ہوئے ہیں اور بڑے سے بڑا گنہگار بھی سچے دل سے توبہ کر کے ان میں سما سکتا ہے۔

☆ یاد رکھیئے! اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پیار اپنے بندوں سے ہے' اپنی مخلوق سے ہے۔ اللہ اپنے بندوں کے دلوں میں موجود ہے۔ جب ہم کسی کا دل دکھاتے ہیں یا کسی کو رنج پہنچاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول لیتے ہیں کیونکہ کسی کے دل کو تکلیف پہنچانا بہت گناہ کا کام ہے۔

☆ اگر ہم اللہ سے پیار کا دعویٰ کرتے ہیں تو ہمیں اس کی مخلوق سے بھی پیار کرنا چاہیئے۔ کسی کو اپنے ہاتھ' زبان اور عمل سے نقصان نہیں پہنچانا چاہیئے۔ جب ہم دوسرے انسانوں سے پیار کرتے ہیں تو اللہ کو بھی ہم پر پیار آتا ہے اور ہمارا اور اللہ کا تعلق خود بخود مضبوط سے مظبوط تر ہوتا جاتا ہے۔

☆ اللہ سے پیار کا تقاضہ ہے کہ ہم اپنے اردگرد دیکھیں اور محسوس کریں کہ دوسرے انسان کس دکھ اور کس تکلیف میں ہیں۔ اپنے مال' جان' زبان اور عمل سے اگر ہم کسی کے لیے کچھ کر سکیں' کسی کی زندگی کو بہتر بنا سکیں تو اس سے بڑھ کر ہمیں کوئی چیز خدا سے قریب نہیں کر سکتی۔ اللہ ان سے پیار کرتا ہے جو اس کی مخلوق سے پیار کرتے ہیں۔ ہم اللہ کے لیے نماز پڑھتے ہیں' روزے رکھتے ہیں' حج اور عمرہ کرتے ہیں۔ بہت ہوا تو صدقات اور خیرات بھی دے دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بس ہمارا کام ہو گیا اور اب ہم نے اللہ تعالیٰ کو راضی کر لیا ہے۔ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ یہ سب اعمال اپنی اہمیت کے حساب سے بہت اہم ہیں لیکن خدا سے اصل پیار اور محبت کا ثبوت ہی یہ ہے کہ ہم اس کی مخلوق کو فائدہ پہنچائیں' دوسروں کی مدد کریں' اپنی زبان' کردار اور عمل سے دوسروں کے کام آئیں۔ اللہ تعالیٰ کے آگے شکر گزار ہونے کا اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا یہ سب سے افضل طریقہ ہے۔

☆ ہیڈن کا قول ہے ''جب میں خدا کا خیال کرتا ہوں تو میرا دل خوشی سے اس طرح بھر جاتا ہے کہ میری لکھائی سے موسیقی بہنے لگتی ہے۔'' بندے کا اللہ سے رشتہ اور پیار ایسا ہونا چاہیئے کہ جب اللہ کا خیال آئے تو آپ کا دل خوشی سے بھر جائے لیکن یہ مقام حاصل کرنے کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن پھر بھی اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ جو سکون اس کیفیت میں ملتا ہے اس کی کوئی قیمت نہیں لگا سکتا۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد کو اپنے دل میں بسائے رکھیں اور اپنے اعمال سے اُسے راضی رکھنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اس سے ہمارا اُس پاک پروردگار سے وہ رابطہ قائم ہوگا جو ہمیں اس دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی سے ہمکنار کر سکے گا۔

☆ _____ ☆

بچوں اور والدین کے کردار کا تعلق

''بچہ'' چھوٹا سا لفظ جو ایک ننھی منی سی جان کا تصور پیش کرتا ہے تو ہم محض مسکرا کر رہ جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے پیار کی لہر اٹھتی ہے اور شفقت ومحبت کے جذبات نظر آتے ہیں اور کچھ ہی دیر میں محبت ختم ہو جاتی ہے' جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں' ہم زندگی کی مختلف مصروفیات میں گم جاتے ہیں اور یہ بچہ اپنی نوعمری کے راستے پر تنہا رہ جاتا ہے دائمی شفقتوں سے محروم' ابدی خلوص سے ناآشنا اچھے برے کی تلاش میں گم ہو جاتا ہے۔

ہمارا سرمایہ حیات جان و مال نہیں بلکہ ہمارے بچے ہیں۔ جو ہمارا کل ہیں۔ جنہوں نے ہماری روایات' اقدار کو آگے بڑھانا ہے۔ جو ہمارا آئینہ ہیں۔ جنہیں صحیح راستے پر چلتا دیکھ کر ہم اپنا سر فخر سے بلند کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ہر بچہ صالح نظریات لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے بچے کی سیرت کی تشکیل اور تعلیم و تربیت پر بہت زور دینا چاہیئے۔

حدیث نبوی ہے کہ:

'' باپ اپنی اولاد کو جو کچھ دے سکتا ہے اس میں سب سے بہترین عطیہ اولاد کی تعلیم و تربیت ہے۔ '' (مشکوٰۃ المصابیح)

بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں نسل در نسل اخلاقی اقدار کی تباہی ہو رہی ہے صحیح اور غلط کی پہچان' حقوق و فرائض کا صحیح علم' زندگی گزارنے کا طریقہ جو صراط مستقیم ہے وہ ایک خواب بن کر رہ گیا ہے۔ آج ہم اپنی ہی بنائی ہوئی کھوکھلی رسومات و روایات اور غلط اقدار کی بدولت اپنی اولاد کو نہ صرف اپنے آپ سے دور کر رہے ہیں۔ بلکہ وہ بری طرح بھٹک بھی چکے ہیں۔ کسی بھی بچے کی تربیت میں اس کی زندگی کے پہلے پانچ سال بے حد اہم ہیں اور یہ ابتدائی سال وہ اپنے والدین کے زیرِ سایہ گزارتا ہے۔ زندگی کے ہر پہلو میں ہر شعبے میں محبت' شفقت' حسنِ سلوک اور صحیح تربیت بچے کی بنیادی ضروریات ہیں۔ وہ ایک ایسی خالی اور صاف شفاف سلیٹ کی مانند ہے جس پر والدین اپنے کردار اور عمل سے جو لکھ دیں اور اس کی شخصیت کا ایک اٹوٹ حصہ بن جاتا ہے۔ والدین اپنی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے حالانکہ ان کا ایک ایک عمل بچے کے ذہن پر نقش ہوتا ہے اور اسی کی بنا پر وہ اپنے آپ کو اس معاشرے میں پیش کرتا ہے۔

گھریلو لڑائیاں پریشانیاں مثلاً والدین کے درمیان کسی بھی مسئلے پر ایک دوسرے کی تذلیل کرنا' کردار کشی اور ایک دوسرے پر الزام تراشی کرنا ایک بچے کے ذہن پر کیسا اثر ڈالے گا؟ وہ اپنی شادی شدہ زندگی کے بارے میں انتہائی بے

یقینی کے عالم میں ہوگا۔ اکثر ایسے ماں باپ کے بچے جو گالی گلوچ کریں، جسمانی تشدد تک بات پہنچی ہو تو ان کی اولاد میں بھی یہی عادت آ جاتی ہے اور نسل در نسل یہ سلسلہ جاری رہتا ہے کیونکہ انسان ویسا ہی بن جاتا ہے جیسے ماحول میں وہ رہتا ہو۔ ایک ریسرچ کے مطابق وہ بچے جن کے والدین جو طلاق یافتہ ہیں ان میں سے 70 فیصد شادی شدہ زندگی میں اسی عمل کی وجہ سے خوفزدہ رہتے ہیں اور ان کی ازدواجی زندگی بے حد متاثر ہوتی ہے کیونکہ ایک خوف اس رشتے کی ناپائیداری اور اس کے ٹوٹ جانے کا ڈر انہیں ساری زندگی کشمکش میں ڈالے رکھتا ہے۔

والدین گھر میں ماحول پر توجہ نہیں دیتے۔ روزمرہ زندگی میں جھوٹ بولنا ایک عام سا فعل ہے۔ مثلاً باپ اکثر بچے سے کہہ دیتے ہیں کہ ''بیٹا کہہ دو کہ ابو گھر پر نہیں ہیں'' کوئی بہانہ بنا کر فون پر ٹال دینا'' اور اسی طرح اس کے سامنے رشوت، دھوکہ بازی اور سفارش کا ذکر جو کہ معصوم ذہن پر اپنے اثرات چھوڑتا ہے اور جب یہی بچہ بڑا ہو کر والدین کی نافرمانی کرے اور جھوٹ بولے اور ان کی عزت نہ کرے تو اسے نفسیات دانوں کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ تو وہ بیج ہیں جو جھوٹ کی صورت میں آپ بو چکے ہیں اب کاٹنا تو پڑے گا۔ قول و فعل میں تضاد یعنی بچوں کو جن فلموں اور گانوں سے منع کرتے وہی خود پسند کرتے ہیں۔ اسی طرح جھوٹ بولنے یا غلط بات کرنے پر لیکچر دیتے ہیں، بڑوں کی عزت کا درس تو دیتے ہیں لیکن عمل نہیں کرتے۔ مائیں بھی یہ سوچے بغیر کہ بچے کی تربیت پر کیا اثر پڑتا ہے اپنے سسرالی رشتہ داروں کی غیبت کرنا اپنا حق سمجھتی ہیں ظاہر ہے بچے بھی اسی کردار کا حصہ بنتے ہیں۔ پھر والدین کو اکثر شکایات رہتی ہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے اب تو بچے عزت نہیں کرتے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن کیا یہ سچ نہیں کہ والدین ہی وہ نہیں رہے جیسے کبھی ہوا کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی اولاد بڑی ہو کر آپ کی عزت کرے یا کہنا مانے تو اسکی عزت کیجئے اور خود ایک اچھے رول ماڈل کے طور پر اسے مثال بن کر دکھایئے۔ شیخ سعدی کا قول ہے۔

''بچوں کے سروں پر اپنا سایہ ڈالو اور جو گرد و غبار ان کے سروں پر پڑا ہے اس کو صاف کرو اور جو کانٹا ان کے پاؤں میں چبھا ہے اسے نکالو۔''

بچے جو سوالات کریں ان کے جوابات بہت سوچ سمجھ کر اور صحیح دینے چاہئیں کیونکہ انسان کی فطرت میں تجسس ہے اور وہ اسی کے تحت ان کے جوابات تلاش ضرور کریں گے۔ وہ غلط ہوں یا صحیح، اسی بنیاد پر ان کے نظریات و اقدار کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ جس بچے کی تربیت وقت کی پابندی اور راست گوئی کے اصول پر کی گئی ہو وہ محض اپنے آرام کے لیے جھوٹے بہانوں میں کبھی پناہ نہیں لیتا۔ ایسا بچہ بڑا ہو کر جفاکش، راست گو، پروقار قابل اعتماد اور مفید شہری ثابت ہوگا۔ لیکن اس کے لیے بے حد ضروری بات یہ ہے کہ والدین ایک مثال کے طور پر اس کے سامنے زندگی

گزاریں۔ کیونکہ کتابوں کو پڑھ کر یعنی فقط تعلیم سے مکمل انسان نہیں بن سکتے اس لیے صحیح علم کی ضرورت ہے جو ساری کائنات میں ہے اور اس کی پہلی آماجگاہ گھر ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی مثال لے لیں ان کی ماں نے دینار کپڑوں میں سی دیئے اور ہدایت کی کہ بیٹے سفر پر جا رہے ہو بس کبھی جھوٹ نہ بولنا اور راستے میں ڈاکوؤں نے پوچھا تو انہیں سچ سچ بتا دیا اس عمل کی بدولت ان کا سردار اتنا متاثر ہوا کہ یہ بچہ اپنی ماں کا کتنا فرمانبردار ہے اور ہم کیسے اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں۔ یہ سوچ کر سارے کا سارا گروہ اسلام لے آیا تو سچ کا یہ سبق جو حضرت عبدالقادر جیلانی کی ماں نے دیا اس کے لیے کسی مدرسے جانے کی ضرورت نہیں پڑی اور نہ ہی کتابوں کو پڑھنے کی۔

حدیث شریف میں ہے کہ:

''تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنی اولاد کے لیے بہتر ہو۔'' (مشکوٰۃ)

والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو بہترین تعلیم وتربیت کے زیور سے آراستہ کریں تاکہ زندگی کے مرحلے میں وہ صحیح فیصلے کریں اور اپنی اقدار بنیادی عقائد کو بھی صحیح رکھیں۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ہم اپنے گھر کے قیمتی سامان کی بے حد حفاظت کرتے ہیں اور اگر کوئی ڈیکوریشن پیس کرسٹل کا ہو تو اسے اپنے ملازم کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے اور ہمارے بچے جو انتہائی نازک احساسات کے مالک اور بہت ہی قیمتی سرمایہ ہیں ملازموں کے حوالے کر کے اپنی مصروفیات جاری رکھتے ہیں۔ اکثر اوقات تو مائیں اپنے سسرالی رشتہ داروں کی مہمان نوازی میں اور گھر کے کاموں میں اس قدر مصروف رہتی ہیں کہ انہیں اپنے بچے کو نظر انداز کرنا ہی پڑتا ہے اور اتنی جھنجھلائی، مصروف اور تھکی ہوئی ماں بچے کو کیا توجہ اور محبت دے سکے گی؟ یا پھر والدین کے آپس کے جھگڑے میں بچے بھی پس جاتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں گے کہ جتنی پریشانی اور ڈپریشن کی زندگی آپ گزاریں یا جیسا رشتہ آپ میاں بیوی کی حیثیت سے رکھتے ہوں آپ کے بچے نہ رکھیں تو ان کے سامنے اچھی مثال قائم کریں۔ تاکہ مستقبل میں وہ اپنے شریک حیات کے ساتھ انتہائی پر اعتماد اور محبت سے بھرپور زندگی گزاریں۔ بچوں کے جذبات کو سمجھیں، ان کے ساتھ دوستانہ ماحول رکھیں۔ انہیں وقت دیں، توجہ دیں اور سب سے بڑھ کر بہترین تربیت دیں۔ کیونکہ وہ ایک ایسے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں جو ہمارے زمانے سے مختلف ہے۔ آپ کے بچوں کو آپ پر اتنا اعتماد ہو اور آپ کے کردار کی بنا پر آپ سے متاثر ہوں کہ ہر فیصلے سے پہلے وہ کسی بھی مشکل میں آپ کو اپنا بہترین دوست پائیں اور ان کی زندگی آپ کے سامنے کھلی کتاب ہو۔ یہ سب تبھی ممکن ہے جب آپ کے قول وفعل میں تضاد نہ ہو۔ آنحضرت ﷺ بھی بچوں سے بے حد شفقت فرماتے اور ان سے بے حد پیار و محبت سے پیش آتے تھے۔

ایک مرتبہ اقرع بن حابسؓ نبی پاک ﷺ کے پاس آئے۔حضور ﷺ اس وقت حضرت حسنؓ کو پیار کر رہے تھے' اقرع کو دیکھ کر تعجب ہوا اور بولے یا رسول اللہ ﷺ! آپ بھی بچوں کو پیار کرتے ہیں' میرے تو دس بچے ہیں لیکن میں نے تو کبھی کسی ایک کو بھی پیار نہیں کیا۔۔۔۔۔نبی پاک ﷺ نے اقرع کی طرف نظر اٹھائی اور فرمایا اگر خدا نے تمہارے دل سے رحمت وشفقت کو نکال دیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں!

روزمرہ زندگی کی مثال لے لیں۔اکثر والدین سفر کرتے وقت گاڑیوں کا شیشہ کھول کر کوئی شے یا چیز وغیرہ باہر پھینک دیتے ہیں بنا یہ سوچے کہ اس فعل کا ان کے بچوں پر کیا اثر ہوگا اور یہ بھی ایسے ہی شہری بنیں گے۔اسی طرح ہم عام طور پر جھوٹ کی بنیاد پر زندگی گزارتے ہیں یا نہ چاہتے ہوئے بھی چھوٹی چھوٹی بات پر بچوں کے سامنے غلط بیانی کرنا ایک رواج بن گیا ہے۔ان کے سوالات کے جوابات میں انہیں خاموش کرا دیا جاتا ہے یا گول مول جواب دے کر پیچھا چھڑا لیتے ہیں۔یہ تو پھر انہی پر منحصر ہے کہ اس کا صحیح یا غلط جواب ڈھونڈے لیکن تلاش ضرور کرلے گا۔تو پھر یہ ایک بہترین جواب والدین ہی کیوں نہیں دیتے؟

باکردار والدین اپنی اولاد کے لیے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔یہ کبھی نہ سوچیں جو دولت آپ رشوت' سفارش اور دھوکہ دہی سے اپنی اولاد کی آسائش کے لیے کمائیں گے وہ انہیں ایک بہترین زندگی دے سکتی ہے۔آپ ان کے لئے دنیا کی ہر قیمتی چیز تو دلا سکتے ہیں لیکن وہ عزت و وقار جو اولاد کے لیے قابلِ فخر وتحسین ہو' نہیں دلا سکتے۔اپنے بچوں کے سامنے اتنے بلند کردار رہیں کہ ہمیشہ نظر ملا کر پورے اعتماد کے ساتھ بات کر سکیں اور کبھی شرمندگی کا کوئی لمحہ نہ آئے۔ہمیشہ یہی ایک کامیاب والدین کی نشانی ہے کہ ان کی اولاد ان کی دولت سے نہیں بلکہ ان کے اچھے کردار اور بہترین تربیت کے بل بوتے پر پہچانی جائے۔بچوں کی تربیت اتنی مضبوط بنیاد پر ہونی چاہیئے کہ وہ اپنی مرضی سے غلط پر صحیح کو ترجیح دیں۔کیونکہ سچ' جھوٹ اور صحیح غلط کا فرق پہچاننا اور اپنے لیے صحیح کا انتخاب کرنا ہی ایک اچھے انسان اور مسلمان کی شان ہے۔ ہم زبردستی ٹی وی بند کر دیں' بچوں کا پارٹیز پر جانا بند کر دیں یا ان پر سختی سے انہیں ایک اچھے مسلمان بنانا چاہیں تو ایسا ممکن نہیں کیونکہ جیسے ہی آپ کی توجہ کہیں اور ہوگی وہ پھر ویسے ہی بن جائیں گے اس لیے انہیں بتائیں کہ ہمیں اپنے ہر عمل کے لیے ایک قیمت ادا کرنا پڑے گی اور اس کے والدین نہیں خدا اس کا حامی وناصر ہے اور اسی کے سامنے سب جوابدہ ہیں اور اس کے ساتھ باکردار ہونے کی مثال سامنے ہو تو انشاءاللہ ہمارے بچے ایک نئی صبح کی طرح بہترین قوم بن کر سامنے آئیں گے۔ بدقسمتی تو یہ ہے کہ ہم سب مسلمان گھرانے میں پیدا ہو گئے اور اسی لیے مسلمان کہلاتے ہیں لیکن اب نئی نسل کو ایک مکمل اور پریکٹیکل مسلمان بنائیں جو اپنی غلطیوں سے سیکھنا جانتا ہو' مقصد حیات ڈھونڈ سکے اور انسانیت کی تمام اقدار سے واقف ہو۔کیا والدین کی حیثیت سے ہم نے انہیں تعلیم کے

ساتھ تربیت بھی دی؟ کیا آپ نے خود ایک اچھے مسلمان ہونے کا ثبوت ان کے سامنے پیش کیا؟ کیا آپ نے انہیں اچھے اور برے کی بجائے صحیح اور غلط کی پہچان بتائی؟ کیا آپ نے کردار کی بنا پر بلند درجہ ہونے کی حقیقت سمجھائی؟ کیا ہم سب وہ کرتے ہیں جس کی اپنی اولاد سے توقع رکھتے ہیں؟ اور بہت سے سوالات ایسے ہی ہیں جن کا جواب اگر آپ ڈھونڈ لیں تو بچوں کی بے راہ روی کے اسباب اور ان کے حل بھی نظر آ جائیں گے۔ تو آج یہ فیصلہ کریں کیا آپ پھر سے ایک نئی نسل کو قربان کرنے کو تیار ہیں؟ یا آج سے ہی خود کو بدل کر آنے والی نسلیں بھی بدل دیں۔

حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے نبی پاک ﷺ نے فرمایا:

'' آدمی کی وراثت میں سے تین چیزیں بہترین ہیں۔ نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرے۔ صدقہ جاریہ جس کا اجر اسے ملتا رہے۔ اس کا سکھایا ہوا علم جس پر لوگ اس کی موت کے بعد عمل کریں۔ ''

(ابن ماجہ ' ابن حبان' طبرانی)

تو پھر سوچیں کہ آپ کے بچے کس ڈگر پر چل رہے ہیں اور کیوں؟ کہیں آپ تو اس کی وجہ نہیں ہیں؟

☆ _____ ☆

ساس اور بہو کا تعلق

کسی بھی انسان کی زندگی کی اہم ترین ضروریات میں گھر سرفہرست ہوتا ہے۔ایک خوبصورت گھر جہاں وہ اپنی زندگی گزارتا ہے۔تجربات اور خوشگوار لمحوں کی یادیں سمیٹتا ہے اور بے شک ایک چھت' ایک سایہ' ماں کی آغوش کی طرح محفوظ گھر جو ہر ایک کا خواب ہوتا ہے اور اسے شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے زندگی میں کافی محنت بھی کرنی پڑتی ہے۔گھر صرف اینٹوں اور پتھروں کی بنی ہوئی چیز نہیں بلکہ ماں باپ' بہن بھائی' میاں بیوی اور بچوں کے وجود سے بنتا ہے۔ورنہ تو صرف مکان ہی کہلاتا ہے۔گھر کے ماحول کو خوشگوار رکھنے کے لیے اور اس کی خوبصورتی کو قائم رکھنے کے لیے خاندان کا ہر فرد اپنا اپنا رول ادا کرتا ہے۔اسے سنوارنے اور سجانے سے لے کر ایک دوسرے کے پیار اور دھیان رکھنے تک سب شامل ہیں۔

والدین ساری زندگی اپنی اولاد کی حفاظت و پیار شفقت کرنے میں گزارتے ہیں۔ان کو اچھا کھلانا' پلانا' تعلیم دلانا' اچھی تربیت دینا' صحیح اور غلط کی پہچان کرانا یہ سب چیزیں ان کے فرائض میں شامل ہیں اور اس کے بعد اولاد کے فرائض میں والدین کی عزت و تکریم کا خیال کرنا اور اس کی خدمت کرنا ہے۔والدین اپنی اولاد کے لیے بہترین فیصلے کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ نہ صرف حال' بلکہ مستقبل میں بھی کامیاب زندگی گزار سکیں۔ ان کے مستقبل کے اہم فیصلوں میں ایک بے حد اہم فیصلہ شادی ہے۔ہمارے مذہب میں نکاح کو پسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے۔نکاح کا مفہوم دو انسانوں کو ان کی مرضی سے ایک ایسے رشتے میں منسلک کرنا ہے جو بے حد نازک اور انتہائی حساس ہوتا ہے۔یعنی وہ دونوں نکاح کے وقت ایک دوسرے کو اچھائیوں' برائیوں' رہن سہن کے طور طریقوں اور خاندان سمیت قبول کرتے ہیں۔

عام طور پر جب تک بیٹے کی شادی نہ ہو تو وہ ماں باپ' بہن بھائیوں کے بہت قریب ہوتا ہے اور اس کی ہر جائز اور ناجائز بات کا خیال کیا جاتا ہے۔اسے ہر جگہ محبت اور پیار ملتا ہے۔لیکن بدقسمتی سے جس دن وہی بیٹا شادی کے بعد گھر میں اپنی بیوی کے ساتھ قدم رکھتا ہے تو سب کی نظر میں عجیب سا بدلاؤ آجاتا ہے۔اس کو اگر غصہ آئے تو بہو کا قصور' اگر دیر سے والدین کو ملنے آئے تو بہو کا قصور اور اگر صحیح توجہ نہ دے سکے تو بھی بہو کا ہی قصور ہوتا ہے۔گھر میں عام طور پر ماں اولاد میں بیٹوں سے زیادہ قریب ہوتی ہے اور ان سے کافی امیدیں وابستہ کئے ہوتی ہے۔ وہ بیٹا جو گھر میں داخل ہوتے ہی ماں کے پاس جاتا ہو' اسے سلام کرنا' اس سے پیار لینا اور اسے وقت دینا اپنا فرض سمجھتا ہو

جب ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے تو اکثر ان فرائض میں کوتاہی ہو ہی جاتی ہے۔ یہاں عام طور پر والدین خصوصاً ماں یہ سمجھتی ہے کہ اس کا بیٹا جس کے لیے اس نے ساری زندگی قربان کر دی اس سے دور جا رہا ہے۔ دوسری طرف آنے والی لڑکی جو اس کی بیـــوی ہے اور بہت سی امیدیں، خواہشات اور خواب لے کر آتی ہے وہ اس سے بہت سی امیدیں رکھتی ہے۔ کیونکہ کسی کی زندگی میں شادی ایک خوبصورت تجربہ ہوتا ہے اس لیے دونوں بہت سی باتوں اور رشتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ بہترین صورت حال یہی ہے کہ سب سے پہلے میاں بیوی کو ایک دوسرے کے مزاج سے آشنائی ہو پھر ہی لڑکی گھر والوں کے ساتھ (Set) ہو سکتی ہے۔

اکثر ایسا نہیں ہوتا اور نئی آنے والی دلہن کو ایک دم ذمہ داریوں کا اتنا احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ دلی طور پر (Adjust) ہونے کی بجائے صرف اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے میں لگ جاتی ہے اور آہستہ آہستہ وہ اپنے شوہر اور بچوں کے لیے وقت نہیں نکال سکتی اور یقیناً دونوں کی (Understanding) نہیں ہو سکتی۔

لڑکے کی ماں یعنی ساس کی (حیثیت) بے شک ایک منصف کی نہیں ہوتی بلکہ اپنی بیـــٹی اور اپنی بہو کے لیے ایک ہی بات، ایک ہی جذبہ مختلف ہوتا ہے۔ اگر بیـــٹی کے سسرال والے اسے شادی کے فوراً بعد گھر کی ذمہ داریوں میں الجھا دیں تو یہ ان کی نظر میں زیادتی اور ظلم ہوگا اور دوسری طرف وہ اسی بیـــٹی کے ساتھ مل کر یا اپنے طور پر بہو کو یہ تلقین کریں گی کہ بس اب ساری ذمہ داریاں خود سنبھالو۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

'' اور جب تم بات کہو تو انصاف ملحوظ رکھو خواہ رشتہ داری ہی کیوں نہ ہو۔ '' (6: 152)

جب شادی ہوتی ہے تو ایک لڑکی اپنا گھر بار، اپنے والدین، اپنے بہن بھائی، ماحول، طور طریقے سب کچھ چھوڑ کر ایک نئی جگہ جاتی ہے اور ساری زندگی ایک شخص کے نام پر لگا دیتی ہے۔ بالکل ایسے ہی کہ جیسے ہم کسی پودے کو اکھاڑ کر نئی جگہ پر لگائیں تو کچھ دن تو مرجھایا ہی رہے گا اور پھر اس کی حفاظت کرنے سے وہ دوبارہ ہرا بھرا ہو جائے گا۔ اسی طرح جب بہو نئی نئی آتی ہے تو اسی پودے کی مانند ہوتی ہے۔ نیا ماحول، نئے لوگ اور نئی رسومات اس کے ساتھ ساتھ ایک انسان جو اس کا شوہر ہے اس کی مزاج آشنائی حاصل کرنا، اس کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھنا بلکہ گھر میں موجود جتنے بھی لوگ ہیں یا رشتہ دار بہن بھائی ہیں ان سب کے الگ الگ مزاج کے مطابق (Adjust) ہونے میں وقت تو چاہیئے۔ ہمارے ماحول میں یہ وقت جو ایک پودے کو مرجھانے سے دوبارہ پھلنے پھولنے تک ہوتا ہے، نہیں دیا جاتا بلکہ اسے محبت و شفقت کی بجائے اس کے ہر فعل کو کسی نہ کسی منفی رویئے سے منسلک کرنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ یہ بات بے شک بہت اہم ہے کہ کسی انسان کی زندگی میں والدین اور بہن بھائیوں کی ایک خاص جگہ ہے لیکن اس کے سامنے تو بیـــوی کا بھی ایک خاص مقام ہے اور اگر ان میں سے کسی کا بھی مقام چھیننے کی کوشش کی جائے تو غلط ہے۔ مومن کی

نشانیاں بیان کرتے ہوئے حضورﷺ کی ایک حدیث شریف ہے کہ :

'' کہ جو چیز یا بات اپنے لیے پسند کرو وہی دوسروں کے لیے پسند کرو۔ ''

(مسلم، ترمذی، بخاری، نسائی)

اسی لیے کوشش یہی کرنی چاہیئے کہ گھر کے ماحول میں گھر کے بزرگ ایک منصف کا رول ادا کریں یعنی اگر وہ اپنی بیٹی کے لیے کچھ پسند نہیں کرتے تو بہو کے لیے بھی پسند نہ کریں۔ ہر انسان تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو اس جگہ پر لے جا کر دیکھے تو اسے بہتر طور پر احساس ہوگا۔ مثلاً اگر ساس بہو کے بارے میں یہ سوچے کہ اس کی جگہ اس کی بیٹی ہو اور وہ اس طرح کے ماحول یا پریشانی میں رہے تو کیا ہوگا۔ اگر یہی آنسو اس کی بیٹی کے ہوں تو ایک ماں کی حیثیت سے اس کے دل پر کیا بیتے گی؟ پس ساس بہو کا رشتہ تو بعد میں پہلے انسانیت کا رشتہ ہونا چاہیئے۔ یعنی ایک انسان کی حیثیت سے ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھیں۔ غصہ، محبت، غم اور اپنے تمام جذبات کو دوسروں پر اسی طرح ظاہر کریں جیسا آپ خود سننا اور محسوس کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں دوسروں سے وہی سلوک روا رکھنا چاہیئے جو ہم پسند کرتے ہیں کہ دوسرے ہمارے ساتھ روا رکھیں۔ ساس اس معاملے میں بہت اہم رول ادا کر سکتی ہے۔ وہ چاہے تو ماحول کو اچھا یا بُرا بنا سکتی ہے۔ اگر ساس کا رویہ متوازن نہ ہو تو اس کے گھر کا ماحول تباہ ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں کدورتیں جمع ہونے لگتی ہیں اور جھگڑوں کا آغاز شروع ہو جاتا ہے۔ ساس ہونے کی حیثیت سے آپ نہ صرف خود ماحول کو بہتر رکھ سکتی ہیں بلکہ اپنی باقی اولاد خاص طور پر بیٹیاں جو ماں کے بہت قریب ہوتی ہیں اور ایک نئی لڑکی کے گھر میں آنے سے اگر توجہ اور پیار بٹ جائے تو محسوس کرتی ہیں اور اکثر حالات میں وہ بہت سی غلط باتیں یا جذبات اپنے اندر جمع کر لیتی ہیں جس کی وجہ سے ماحول پر اثر پڑتا ہے۔ لیکن انہیں اس بات کا احساس دلانا بھی ساس کا ہی فرض ہے۔ جو لڑکی اپنے والدین، بہن بھائی اور گھر بار چھوڑ کر آئی ہے اسے اگر پیار محبت نہیں دیں گے تو آہستہ آہستہ وہ سب سے دور ہوتی جائے گی اور یہ بھی سمجھنے کی کوشش کریں کہ ان کے بیٹے یا بھائی نے نئی زندگی میں قدم رکھا ہے۔ جہاں اس کے فرائض بہت بڑھ گئے ہیں اور جیسے ان کے باپ نے اپنی بیوی بچوں کو ہمیشہ خوش حال اور سکون میں رکھا۔ یہی وہ بھی کرنے کی کوشش کرے گا کیونکہ یہ بھی اس کا فرض ہے اور انہیں اسکا گھر بنانے میں اس کی مدد کرنی چاہیئے کہ دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کا موقع ملے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ والدین کی تربیت اور ان کی کامیابی ہے کہ ان کے بچے ایک خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں ورنہ دوسری صورت میں ان کے بچے کی زندگی پر بھی اثر ہوتا ہے اور گھر کے ماحول پر بھی۔ ان تمام مسائل کا حل صرف یہی ہے کہ جو کچھ آپ اپنے لیے اور اپنی بیٹیوں کے لیے مناسب سمجھیں وہی اپنی بہو کے لیے بھی مناسب سمجھیں۔

قرآن پاک کے الفاظ ہیں:

'' اور میرے بندوں سے کہہ دو (لوگوں سے) ایسی باتیں کیا کریں جو بہت پسندیدہ ہوں۔ کیونکہ شیطان (بری باتوں) سے ان میں فساد ڈلوا دیتا ہے کچھ شک نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ (17: 53) ''

تقریباً ہر عورت کی زندگی میں یہ مرحلہ ضرور آتا ہے کہ جب وہ بہو اور پھر ساس بنتی ہے۔ اب یہاں آپ کی اپنی پسند ہے اگر آپ ایک اچھے انسان بھی ہیں اور دوسروں کے دکھ درد' سکھ' احساسات اور ضروریات کا خیال بھی رکھتے رہے ہیں اور ہر رشتے کو قائم رکھتے اور اچھا بناتے ہیں تو یہ خوبیاں آپ کا ساتھ ضرور دیں گی۔ ہمارے معاشرے میں 'مشترکہ خاندانی نظام' زیادہ ہے۔ اس لیے ایک گھر میں جہاں مختلف مزاج کے لوگ رہتے ہیں ان سب کو ایک دوسرے کا خیال رکھنا چاہیئے۔ بہو بھی اگر یہ جانتی ہے کہ اس کے شوہر کے خاندان والے بے حد اچھے ہیں اور اسے اپنائیت کا احساس ہو تو وہ کبھی بھی غلط ثابت نہ ہوگی کیونکہ جب وہ اس کے گھر میں آتی ہے تو وہ ایک دھلی ہوئی صاف ستھری سلیٹ کی مانند ہوتی ہے جس پر جو بھی لکھا جائے گا وہی اس کے مزاج میں شامل ہو جائے گا۔ اپنے آپ کو اپنی بہو کے رول میں رکھ کر دیکھیں کہ اپنی ساس سے کیا شکایات اور الجھنیں ہو سکتی ہیں۔ اگر آپ کی زندگی میں لڑکے کی ماں جو آپ کی ساس ہیں ان کی طرف سے زیادتی ہوئی تو اس کا بدلہ اگلی نسل سے نہ لیں بلکہ ایک مثالی ساس بنیں اور بہو کی نظر میں اتنا احترام کا مقام بنائیں کہ وہ دل سے آپ کی عزت کرے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو لڑکی اپنی ساس کے انتہائی سخت رویئے کے ساتھ رہی ہو وہ اپنی بہو کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کرے گی۔ کیونکہ نفسیاتی طور پر وہ اپنی ساس کی طرح رعب و دبدبہ اور حکم چلانا اس کے مزاج میں شامل ہو جائے گا اور جب اس کا بس چلے گا تو وہ یہی طریقہ آگے اختیار کرے گی۔ اس کے برعکس اگر یہ سوچا جائے کہ ٹھیک ہے جو بھی میرے ساتھ ہوا اسے میں دوبارہ کبھی نہیں دہراؤں گی بلکہ وہ تمام آسانیاں اور اچھا ماحول اپنی بہو کو دوں گی جو کہ میری بھی خواہش تھی۔ اسی طرح گھر میں جب بہو ماں بنتی ہے اور اگر وہ بیٹی کی ماں بنے تو سب سے پہلے ساس اس پر افسوس ظاہر کرتی ہے کیونکہ اس نے بھی ایسا ہی دیکھا اور سنا ہوگا لیکن وہ اپنا فرض اور صحیح رول ادا کر سکتی ہیں کہ آج کی بیٹی ہی کل کی ماں ہے تو پھر افسوس کس بات کا اور ایک عورت کی حیثیت سے تو ساس کو پورا تحفظ دینا چاہیئے کہ ایک رحمت ان کے گھر پر برسی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے بیٹوں کو احساس دلانا کہ تمہاری لڑکی پیدا ہوئی ہے لہٰذا بیوی سے جھگڑا کرو' ساس ہی کا کام ہوتا ہے اور بعض اوقات تو یہ نوبت طلاق تک پہنچ جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:

ایک عورت کی حیثیت سے ساس کو یہ ضرور سوچنا چاہیئے کہ جیسے اسے اپنے شوہر' بچوں اور اپنے گھر سے بے تحاشہ

محبت تھی اسی طرح کی بہو کو بھی ہے اور وہ بھی آپ کی ہی طرح ایک اپنا چھوٹا سا خوبصورت گھر بنانا چاہے گی جہاں کی وہ مالک ہو تو ان جذبات کو سمجھنا چاہیئے اور اسے گھر میں مکمل ذمہ داری کے ساتھ شخصی آزادی اور انسانیت کا احساس دیں تا کہ یہی گھر جو آپ کی جنت ہے اس کے لیے وہ بھی اسی طرح محسوس کر سکے اور جیسے اولاد کی غلطیاں معاف کرنا اور ان کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھنا ماں کی شان ہے' آپ اپنی بہو کے لیے بھی ویسا ہی سلوک رکھیں۔

یہ تو تصویر کا ایک رخ ہے اب دوسری طرف بہو کے فرائض ہیں جو ایک گھر کے ماحول کو پُر سکون رکھنے اور اسے مثالی بنانے میں بنیادی حیثیت کے حامل ہیں۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ کچھ بھی اچھا بنانے کے لیے اچھا انسان بننا بے حد ضروری ہے اور اگر آپ ایک با کردار اور متوازن شخصیت ہیں تو پھر کوئی بھی ٹائیٹل ہو آپ ایک خوبصورت فضا برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

بہو ایک گھر میں بہت سے خواب اور امیدیں لے کر آتی ہے اور ساتھ ساتھ ایک خوف بھی جو نئی جگہ پر رہنے کا ہوتا ہے۔ لیکن چند دنوں میں خوشگوار مزاج سے اور سوجھ بوجھ سے وہ اپنا مقام بنا سکتی ہے۔ اپنے ماں باپ کے بعد وہاں بزرگانہ حیثیت میں شوہر کے والدین ہیں جنہیں عزت واحترام سے لے کر محبت تک سب دے سکتی ہے۔ کیونکہ اس نے ساری زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا اور اس گھر کو چنا' اب وہاں اچھا ماحول رہے تو زندگی آسان ہوگی۔ اپنے دل و دماغ کو مختلف توہمات سے پاک رکھنا بے حد ضروری ہے۔ عام طور پر بہوئیں آتے ہی اس فکر میں ہوتی ہیں کہ کس طرح شوہر ہر بات' ہر رشتے کو بھول کر صرف اس کی طرف توجہ دے تو یہ غیر فطری ہے۔ اچھی طرح جان لیں کہ ایک شخص جو کہ آپ کا شوہر ہے اگر اپنی ماں سے جھوٹ بول کر یا برا بھلا کہہ کے آپ کو خوش کر سکتا ہے تو کل وہ کسی اور کو خوش کرنے کے لیے آپ کے ساتھ بھی جھوٹ بول سکتا ہے۔

بے شک والدین کی خدمت کرنا بیٹے کا فرض ہے اور بہو پر لازم نہیں ہے لیکن بات صرف یہاں ختم نہیں ہوتی' جب آپ ایک انسان کے ساتھ ہر دکھ سکھ اور زندگی کے ہر پہلو میں ساتھ دینے کا فیصلہ کرتے ہیں تو پھر اس کی ذمہ داریاں بھی share کی جاتی ہیں۔ اس لیے اس کی ماں کی عزت وخدمت کا اصول نہ صرف گھر کا ماحول خوشگوار رکھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ ویسے بھی ایک دردمند انسان جو دوسروں کے لیے ایک احساس رکھتا ہے مدد کا جذبہ اور ان کی تکلیفوں کو محسوس کرتا ہے تو اسی جذبہ کے تحت بہو پر بھی فرض ہے کہ اگر گھر میں ساس بیمار و لاچار ہے اور بیٹے پر انحصار کرتی ہے تو اسے انسانیت کے ناطے اس کا حق ضرور ادا کرنا چاہیئے۔

ایک منصف کی حیثیت سے فیصلہ کرنا ہو تو ساس کو اپنی ماں کی جگہ رکھیں اور سوچیں کہ اگر آپ کے والدین کے گھر میں ایسا ہی غیر ذمہ دارانہ رویہ ہو تو آپ کو کیسا لگے گا۔ اگر ہم اس طرح کی صورتِ حال میں یہ سوچ لیں کہ شاید یہ

موقعِ غنیمت ہے اور ہمارے ہاتھوں کوئی نیکی کا کام ہوسکتا ہے تو سب کام آسان ہو جائے گا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

'' جو شخص نیک اعمال کرے گا مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہوگا تو ہم اس کو دنیا میں پاک اور (آرام کی) زندگی سے زندہ رکھیں گے اور ان کے اعمال کا نہایت اچھا صلہ دیں گے۔ ''

(16: 97)

اپنی ساس کے جذبات کو اس کی جگہ پر رکھ کر سوچیں کہ ایک بیٹا جس کی آپ پرورش کرتے ہیں' اپنے دن رات آرام وسکون' نیند اور خوشی اس کے لیے قربان کرتے ہیں وہی بیٹا اس کے جواب میں ایک نئے رشتے میں منسلک ہو کر آپ کو نظر انداز کرے اور آپ کی وہی باتیں جو اسے پسند تھیں بری لگنا شروع ہو جائیں تو آپ کیا محسوس کریں گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ماں اپنے بیٹے کی خوشی اور اچھے مستقبل کی دعا کرتی ہے لیکن اس کے بدلے میں پیسہ نہیں بلکہ احترام اور توجہ چاہتی ہے اور بہو یہ اچھی طرح جان لے کہ انسانیت کا رشتہ ہر رشتے پر حاوی ہے۔ ایک بیمار ماں جو آپ کے سہارے پر ہے اور شریک حیات ہونے کی حیثیت سے اس کے دکھ اور غم بانٹنا' اس کی خوشیوں کا خیال رکھنا' اسے صحیح اور غلط بتانا اس کی زندگی کو آسان بنانا آپ کے لیے ضروری ہے اور ان سب میں اگر اس کی ماں جس سے وہ بے حد پیار کرتا ہے وہ بھی شامل ہو اور زیادتی کی کوئی وجہ نہ ہو تو آپ پر ایک شریکِ حیات کی حیثیت سے فرض ہے کہ اس کا ساتھ دیں' ان کی خدمت میں ان کا خیال رکھیں۔ جن کی وہ اولاد ہے اور جنہوں نے اسے اس قابل بنایا کہ وہ آپ کے لیے زندگی کی آسائشیں مہیا کر سکے۔ ساس اور بہو کے اس جھگڑے میں یہ دونوں لفظ اتنے خوفناک لگتے ہیں کہ جیسے زیادتی' ظلم اور انتہا پسندی کے لیے بولے جاتے ہیں۔ لیکن جیسے کہا جاتا ہے کہ الفاظ میں معنی نہیں ہوتے بلکہ معنی تو انسانوں میں ہوتے ہیں۔ اس لیے لفظ ماں ہو یا ساس بہو ہو یا بیٹی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ اصل بات رشتوں کے تقدس کو قائم رکھنے کی ہے۔

گھر کے ماحول کو اچھا رکھنے کے لیے ساس بہو جو گھر کی سلطنت کی وزیرِ اعظم تصور کی جاتی ہیں اگر وہ اس رشتے کی اہمیت کو جان لیں اور کسی بھی جھگڑے کی صورت اختیار کرنے سے پہلے ہی یہ کوشش کریں کہ آپس کی باتیں اور بدگمانیاں دور کر لیں۔ معاف کرنا سیکھیں جیسے اولاد سے غلطیاں ہوں تو ماں نہ صرف چشم پوشی کرتی ہے بلکہ معاف کر دیتی ہے اور بھول جاتی ہے۔ اسی طرح جب اپنی ماں غصے میں آتی ہے اور کچھ کہہ دیتی ہے تو ایک بیٹی کی طبیعت میں فرق نہیں پڑتا وہ ناراض ضرور ہوگی لیکن بدگمان نہیں۔ ایک دوسرے پر اعتماد کریں اور دوستانہ ماحول رکھیں دکھ درد میں ایک دوسرے کو شریک کریں اور گھر کے امور و مسائل باہمی مشورہ اور غور و فکر سے حل کریں۔ اپنی باتیں اور خیالات'

احساسات اور جذبات ایک دوسرے کو بتائیں۔گھر میں بہو کو چاہیئے کہ وہ اپنی ساس کو یہ احساس دلائے کہ وہ اسکے بیٹے کو چھیننے نہیں آئی بلکہ وہ تو خود اس کے شفقت کے سائے تلے اپنی زندگی گزارنا چاہتی ہے اور اس کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔اس طرح وہ ماں جو بیٹے کے دور ہونے سے پریشان ہوگی جب اپنی بہو کو بھی اپنے قریب پائے گی تو کافی حد تک اس کی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔

دوسری طرف ساس کا بھی فرض بنتا ہے کہ اپنے بیٹے کا گھر بساتے ہوئے یہ سوچ لے کہ جیسے اس کی زندگی میں خواہشات تھیں ویسے ہی خواہشات آنے والی لڑکی کی بھی ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے کے لیے وقت چاہیئے۔وہ بھی بہو کو اپنے پاس بٹھائے' پیار کرے' اس کے دل کو ٹٹولے اور اس کو زندگی کا صحیح راستہ بتائے۔ایک ایسے گھنے سائے کی طرح ثابت ہو جہاں پر بیٹھ کر آپ زندگی کے تمام غم اور تکلیفیں بھول جائیں۔اس بے حد مقدس رشتے میں ایماندار' مخلص اور مددگار رہنا بے حد ضروری ہے۔اگر ایسا ممکن ہو جائے تو نہ کہیں چولہا پھٹ جانے سے بہو جلے اور نہ ہی کوئی لاچار بوڑھی عورت بیٹے کے ہوتے ہوئے سرکاری ہسپتالوں یا Old Hose میں پڑی ہو۔اب یہ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ آپ واقعی انصاف کریں گی اس سے پہلے کہ معاشرے میں یہ رشتہ اپنا تقدس اور عزت بالکل کھو دے اور آپ اس کا ایک حصہ ہوں۔محبت' پیار' خلوص ہر انسان کو بدل سکتا ہے اگر لگن سچی ہو تو یہ رشتہ تو بہت پیارا ہے جو ایک ماں بیٹی' دوست اور غمخوار کا ہو سکتا ہے اور بے شک قابل احترام بھی ہے جسے ہم ساس اور بہو کے نام سے پکارتے ہیں۔

☆ _____ ☆

گھریلو ملازمین اور مالکان کا تعلق

اگر ہم اپنے چاروں طرف نظر دوڑائیں تو ہمارا معاشرہ طرح طرح کے مسائل سے دوچار نظر آتا ہے۔ تعلیم کی کمی اور علم کے فقدان نے ہمارے ہاں ایک عام انسان کی زندگی کو مشکل ترین بنا دیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی کسی بھی صحت مند معاشرے کی بنیادی علامت ہوتی ہے اور اگر وقت کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھ کر مثبت تبدیلی نہ لائی جائے تو معاشرہ بے چینی اور بدنظمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں بے سکونی اور بے راہ روی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہزاروں مسائل کے ساتھ ساتھ کچھ چھوٹی چھوٹی ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جن کو ہم نظر انداز کر دیتے ہیں جبکہ ان کا ہماری زندگیوں پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ ملازمین کا مسئلہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

جب اسلام آیا تو اس وقت غلاموں اور باندیوں کا طبقہ موجود تھا اور اس طبقے کے لوگوں کے حقوق و فرائض واضح کر دیئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ملازمین اور خدمت گزار لوگوں کے متعلق بھی احکام دیئے گئے اور ایک ایسا نظام تشکیل دیا گیا جس کے نتیجہ میں شرعاً اجازت کے باوجود مسلمانوں میں غلاموں اور باندیوں کا وجود ختم ہو گیا۔ جبکہ اس دور میں یہ رواج پوری دنیا میں تیزی سے پھیل چکا تھا اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کو اس مسئلہ کے حل میں کہیں زیادہ وقت لگا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یورپ اور امریکہ جیسے ممالک بھی اس لعنت سے بیسویں صدی کے نصف تک پیچھا نہیں چھڑا سکے۔ یہ اور بات ہے کہ جیسے جیسے مسلمان اسلامی نظام زندگی سے دور ہوتے گئے وہی قدریں اور روایات نئی شکل و صورت میں دوبارہ ہمارے معاشرے میں رواج پا چکی ہیں۔ یہ ہم سب جانتے ہیں کہ اسلام جس وقت بھیجا گیا تھا وہ جاہلیت کا زمانہ تھا' ذہنی پستی اور انسانی اقدار کی تباہی اپنے عروج پر تھی۔ اسلام نے آ کر انسانیت کو تباہی سے بچایا اور اب اگر ہم دوبارہ اسی ڈگر پر چل رہے ہیں تو تباہی ہمارا مقدر بن سکتی ہے۔ نئے سرے سے کوئی پیغام تو آئے گا نہیں اور ہم دی گئی ہدایات کو دقیانوسی قرار دے کر ایک طرف رکھ دیں تو یہ ہماری ناسمجھی ہوگی۔ کیونکہ کوئی اور نظام زندگی ایسا نہیں ہے جس نے زندگی کے ہر شعبے سے متعلق اتنی ٹھوس ہدایات دی ہوں جو ہمیں اسلام نے دی ہیں۔ یہاں تک کہ ملازمین کے حقوق و فرائض جیسے مسئلے کو بھی پوری تفصیل کے ساتھ واضح کر دیا۔

جب اسلام آیا تو غلاموں کے ساتھ بدترین سلوک کیا جاتا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے مسلمان سوسائٹی کو یہ ہدایت کی کہ ان کے ساتھ انسانوں کا سلوک روا رکھا جائے۔ جیسا کہ غلاموں کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا:

'' اور اس پر کسی ایسے کام کا بوجھ نہ ڈالے جو اس کی طاقت سے باہر ہو اور وہ اسے کر نہ پا رہا ہو تو اس

کام میں اس کی مدد کرے۔'' (مسلم)

ایک اور حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کس طرح کا کھانا اور کپڑا ملازم کو دیا جائے۔

'' لونڈی اور غلام تمہارے بھائی ہیں انہیں اللہ نے تمہارے تصرف میں دے رکھا ہے تو جس بھائی کو اللہ نے تم میں سے کسی کے تصرف میں دے رکھا ہو تو اس کو چاہیئے کہ وہ اسے وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے اور اسے وہ کپڑا پہنائے جو وہ خود پہنتا ہے۔ '' (بخاری، مسلم، احمد، داؤد)

ایک اور حدیث کے مطابق آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ:

'' جب تم میں سے کسی کا خادم کھانا پکائے۔ پھر اسے پاس لے کر آئے اور حال یہ ہے کہ اس نے کھانا پکانے میں گرمی اور دھوئیں کی مصیبت برداشت کی ہے تو مالک کو چاہیئے کہ اسے ساتھ بیٹھا کر کھانا کھلائے اور کھانا اگر تھوڑا ہو تو ایک یا دو لقمے اس کے ہاتھ میں رکھ دے۔ '' (مسلم)

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

'' اپنے غلاموں اور خادموں پر اپنے اختیار کو غلط استعمال کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ '' (ترمذی، ابنِ ماجہ)

ایک بار لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ کیا آپ ﷺ نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ اس امت میں غلام اور یتیم زیادہ ہوں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں میں نے تمہیں یہ بات بتائی ہے پس تم اپنی اولاد کی طرح ان کی خاطر کرو اور ان کو وہ کھانا کھلاؤ جو تم کھاتے ہو۔

خادموں کے ساتھ سلوک کے بارے میں ابوقلابہؓ سے روایات ہے۔

'' ابوقلابہؓ کہتے ہیں کہ حضرت سلمان فارسیؓ کے پاس گورنری کے زمانے میں ایک آدمی آیا اس نے دیکھا کہ آپ اپنے ہاتھ سے آٹا گوندھ رہے ہیں پوچھا یہ کیا؟ حضرت سلمان فارسیؓ نے کہا کہ ہم نے اپنے خادم کو کام سے باہر بھیج دیا ہے اور ہمیں یہ ناپسند ہے کہ اس کے اوپر دونوں کاموں کا بوجھ ڈالا جائے۔ ''

آیئے دیکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں ملازمین کی کیا حیثیت اور کردار ہے۔ ملازمین کی دو قسمیں ہیں ایک ملازم جو چوبیس گھنٹے مالکان کے ساتھ رہتے ہیں، دوسرے وہ جو خدمت گزار وقتی طور پر آ کر کام کرتے ہیں۔ پہلی قسم کے وہی حقوق و فرائض ہیں جو غلاموں اور باندیوں کے لیے وضع کئے گئے ہیں کیونکہ عام طور پر یہ اسی طبقے کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ ہمارے معاشرے میں اس طبقے سے تعلق رکھنے والے ملازم عام طور پر زمیندار اور دوسرے بڑے گھرانوں

میں پائے جاتے ہیں۔اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ ملازم نسل در نسل خاندانوں کی خدمت کرتے ہیں اور یہ لوگ بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ ان کے باپ دادا ہمارے باپ دادا کے خدمت گزار تھے اور ان کے بچے ہمارے بچوں کے ملازم ہیں۔اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ جب کوئی انسان نسل در نسل غلامی برداشت کر رہا ہوگا وہ اپنے آپ کو اتنا ہی کمزور محسوس کرے گا۔اس کے لیے تو یہی بہت ہے کہ اسے دو وقت کی روٹی مل جائے اور مالک اس کے بدلے اس سے کچھ بھی کرالے۔کیونکہ اس نے اپنے باپ دادا کو بھی یہی کرتے دیکھا ہے اسے صرف یہی کرنا آتا ہے۔اسے تعلیم اور کسی بھی ایسی صلاحیت سے ناواقف رکھا جاتا ہے جس سے اس میں خود اعتمادی پیدا ہو۔اسی طرح کے ایک گھرانے میں جانے کا اتفاق ہوا ان کا ملازم بہت تہذیب یافتہ طریقے سے چائے لے کر آیا۔پھر سب کو چائے پیش کی اور چپکے سے کونے میں گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔محسوس ایسا ہوا کہ اسے کوئی پریشانی ہے یا پھر طبیعت خراب ہے۔میزبان سے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ایسے ہی رہتا ہے کیونکہ اس کی تربیت ایسے ہی کی گئی ہے۔چھ فٹ کا نوجوان جس کی عمر بیس یا بائیس سال ہوگی مظلومیت کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔نفسیاتی تجزیہ کے مطابق اس طرح کا انسان بے انتہا احساس کمتری یا پھر Self-Piety جیسی ذہنی بیماریوں کا شکار ہوسکتا ہے۔جبکہ اس کے مالکان کا کہنا ہے کہ یہ تو بچپن سے ہی ہمارے پاس ہے اور ہم نے اسے اپنے بچوں کی طرح پالا ہے۔اگر اسے بچوں کی طرح پالا گیا ہوتا اور تعلیم دلوائی جاتی، کوئی ہنر سکھایا جاتا اور ایک ایسا انسان بنانے کی کوشش کی جاتی جو خود اعتمادی سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لیے تیار ہوتا۔ جبکہ صورت حال اس کے برعکس تھی اور جب ان لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ یہ غلط ہے تو جواب یہ ہوگا کہ ہمارا دماغ خراب نہیں ہے کہ ان کو پڑھا لکھا کر ان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔یعنی اگر وہ کسی ملازم کو علم کی روشنی دیں گے یا اسے کوئی ہنر سکھا دیں گے تو یقیناً وہ اپنا اچھا برا سمجھنے کے قابل ہو جائے گا اور کسی کی غلامی نہیں کرے گا۔

اس طرح ملازموں کو رکھنا یہ انسانوں کو غلام بنانے کا ایک جدید طریقہ ہے جو ہمارے معاشرے میں بھرپور انداز میں اپنایا اور قبول کیا جاتا ہے۔المیہ یہ ہے کہ اسے (Status) کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ ایک اور رواج جو کہ ہمارے معاشرے میں بڑی تیزی سے پھیل چکا ہے وہ بچوں کو ملازم بنانے کا ہے۔غریب ماں باپ بھوک یا قرض کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے بچے لوگوں کے گھروں میں چھوڑ دیتے ہیں اور ان کے بدلے سال یا پھر چھ مہینوں کا ایڈوانس لے جاتے ہیں اور پیسے والے لوگ ان غریبوں کی مجبوریوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں اور ایڈوانس رقم ایک غریب کو یک مشت ملنا بہت برا ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس کے بدلے میں ان کے بچے ملازم رکھ لیے جاتے ہیں اور بعض حالات میں یہ پابندی بھی لگا دی جاتی ہے کہ جب تک کے لیے یہ پیسے لیے گئے ہیں اس وقت تک بچوں سے ملنے نہ آنا۔ظلم کی انتہا

ہے کہ بچوں کو چند پیسوں کے عوض مخصوص وقت کے لیے خرید لیا جاتا ہے اور بچے تو اتنے معصوم ہوتے ہیں کہ ان پر جو ظلم ہوتے ہیں ان کو احساس بھی نہیں ہوتا اور وہ اپنی کھیل کود کی عمر ان پیسے والوں کی نذر کر دیتے ہیں اور اس طرح وہ غریب ہونے کی قیمت چکاتے ہیں۔ یہ ظلم ہر گھر میں ہو رہا ہے۔ بلکہ پاکستان کی ایک ایسی نامی گرامی شخصیت کے گھر جانے کا اتفاق ہوا جنہوں نے اپنی تحریروں میں اچھائی اور برائی بتاتے ہوئے زندگی گزار دی ہے۔ یہ دیکھ کر بے انتہا تکلیف ہوئی کہ انہوں نے بھی ایک بچہ ملازم رکھا ہوا ہے جو مہمانوں کی خاطر کر رہا تھا۔ پوری قوم کو گائیڈ کرنے والوں کا اگر یہ حال ہے تو پھر تباہی ہمارے مقدر میں لکھی جا چکی ہے۔ یہ ملازمین کی دو بھیانک صورتیں ہیں اس کے علاوہ ہمارے ہاں متوسط طبقہ بھی ملازمین کے حقوق و فرائض کے چکر میں بری طرح پھنسا ہوا ہے۔ کیونکہ اس طبقے کے پاس اتنے وسیع ذرائع وسائل نہیں ہیں کہ وہ ملازموں سے مناسب رویہ رکھ سکیں یعنی اسے کھانے کو وہی دے سکیں جو خود کھاتے ہوں' اسی طرح کا لباس دیں جو اپنے لیے پسند کرتے ہیں اس لیے وہ اپنی ذمہ داریوں کی طرف سے آنکھیں بند رکھتے ہیں اور ڈھیٹ بن جاتے ہیں اور سب کچھ سمجھنے اور جاننے کے باوجود معاشرے میں رکھ رکھاؤ کی خاطر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ ملازم رکھنا ہر حال میں ضروری ہے۔ چاہے اس کے بدلے تکلیف ہی برداشت کرنی پڑے۔ یہ طبقہ ایسے ملازمین پر اکتفا کرتا ہے جو (Part Time) کام کرتے ہیں لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر (Part Time) ملازمین دل لگا کر کام نہیں کرتے اور ان میں چوری چکاری کی عادت عام پائی جاتی ہے۔ ایک خاتون نے باہر کے کسی ملک سے پاکستان آ کر رہائش اختیار کی۔ ہمسایوں سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا کہ یہاں کام وغیرہ کے لیے کیا کیا جاتا ہے انہیں بتایا گیا کہ ملازم رکھے جاتے ہیں کھانا پکانے کے لیے خانسامہ' گاڑی چلانے کے لئے ڈرائیور' بچوں کے لیے آیا یا ماسی۔ مزید غلام صفائی' کپڑے دھونے اور استری کے لیے اور مالی' چوکیدار بھی رکھے جاتے ہیں اور آپ کو ضرورت ہو تو کسی کو بھجوا دیں گے۔ خاتون پریشان تو بہت ہوئی لیکن یہ سن کر کہ اگر یہاں کا دستور ہے تو جیسے باقی لوگ کر رہے تھے اس نے یہی کرنا مناسب سمجھا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ گھر کے افراد صرف دو میاں بیـــوی اور ایک بچہ تھا اور نوکروں کی فوج تھی۔ چونکہ خاتون کو نوکروں کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں تھا اس لیے انہوں نے بڑا اچھا سلوک ان سب کے ساتھ رکھا۔ آہستہ آہستہ انہیں احساس ہوا کہ ماچس ہو یا گھی کا ڈبہ' پھر پیسے کہیں رکھ دیئے ہوں' گھڑی ہو یا انگوٹھی وغیرہ چیزیں غائب ہونا شروع ہو گئیں۔ اتنے ملازموں میں یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ کس کی عادت چوری کی ہے اور کس کی نہیں۔ پریشان ہو کر خاتون ہمسائی کے پاس گئی اور صورت حال واضع کی تو انہوں نے بڑی سادگی سے کہا کہ اگر ان سے کام لینا ہے تو ایسے ہی چلے گا بس جو چیزیں گم ہو جائیں سمجھو وہ بھی ان کی تنخواہ کا ہی حصہ تھا۔ یعنی اندازہ لگائیں کہ ملازموں کو رکھنے کی کیا قیمت دی جاتی ہے صرف اس لیے کہ لوگ اپنا کام خود نہیں کرتے بلکہ اسے اپنی شان

کے خلاف سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملازم اپنے طور طریقوں سے مالک کو خوب پریشان کئے رکھتے ہیں اس کے باوجود لوگ انہیں برداشت کرتے ہیں۔

ملازم رکھنے کا رواج ایک دستور جو ہمارے کلچر کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ جبکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دقیانوسی طریقہ زندگی کی ایک مثال ہے۔ ترقی یافتہ ممالک اب اس لعنت سے پیچھا چھڑا چکے ہیں جبکہ مسلمان قوم ہونے کے ناطے ہمیں اپنا طرز زندگی اس وقت تک بدل لینا چاہیئے تھا۔ جب اسلام نے بہترین نظام زندگی پیش کیا تھا اور پھر دنیا کی رہنمائی اسی طرز پر کی جانی چاہیئے تھی۔ لیکن مسلمان قوم کچھ غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں کا شکار رہی ہے جس کے نتیجے میں اس قوم نے وقت کے ساتھ بدلنے اور مزید بہتری کے عمل کو بالائے طاق رکھ دیا۔ مسلمان قوم اپنے آپ کو بہترین قوم (Privileged) سمجھتی ہے کیونکہ اس کے پاس بہترین کتاب اور بہترین رول ماڈلز ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر ہم نے بہترین چیزوں کا استعمال ہی نہیں کیا تو طاق میں رکھی کتاب ہمیں کچھ نہیں سکھا سکتی۔ اکثر لوگ قرآن پاک کو گھر میں ضرور رکھتے ہیں کہ یہ رحمت و برکت کا باعث ہے اور وہ ثواب کمائیں گے یا پھر اسے ''رٹو طوطوں کی طرح'' پڑھتے جاتے ہیں' یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ جس تک پیغام نہیں پہنچا اس کی تو شاید معافی ہو جائے لیکن جس انسان کے پاس صحیح پیغام پہنچا اور پھر اس نے عمل نہیں کیا اس کی لیے کافی مشکل ہوگی اور اس لحاظ سے تو ہر مسلمان کے پاس پیغام پہنچ چکا ہے۔ اس سے آگے اس پر عمل کر کے وہ طرزِ زندگی اپنانا جو ہر ایک مسلمان کا فرض ہے اور پوری مسلمان قوم کا حق ہے اس کی ذمہ داری ہر ایک مسلمان پر عائد ہوتی ہے نوکروں کے معاملے میں ہم پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جس کا حکم دیا گیا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ کسی انسان کا دل دکھانا ہے۔ اندازہ لگائیں جن بچوں کو ہم ملازم رکھتے ہیں ان کے ماں باپ پر کیا گزرتی ہوگی اور جب ہم ان سے اپنے بچوں کے کام کرواتے ہیں تو ان بچوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ اپنے سروے کے دوران ایسے لوگوں سے ملنے اور پوچھنے کا موقع ملا کہ دنیا کا کون سا مذہب یا قانون ہے جو بچوں سے کام کروانے کی اجازت دیتا ہے تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ یہ تو خوش قسمت ہیں جو اس حال میں ہیں۔ جس میں ہم نے انہیں رکھا ہے ورنہ یہ تو سڑکوں پر پڑے ہوں اور ہم تو ان کے ساتھ اپنے بچوں جیسا سلوک کرتے ہیں ساتھ ہی خاتون نے آواز دے کر بچی کو بلایا اور کہا یہ میز صاف کرو اور پھر چائے لے کر آؤ۔ یقیناً آپ ایسا سلوک اپنے بچوں کے ساتھ تو نہیں کرتے۔ نفسیاتی تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ایسے بچے جذباتی اور ذہنی طور پر سخت تذبذب اور تکلیف کا شکار ہوتے ہیں۔ جن گھروں میں ملازمین سے برا سلوک کیا جاتا ہے یا بچوں سے کام لیا جاتا ہے خدا کی نظر میں وہ لوگ مسلسل گناہ کا ارتکاب کر رہے ہوتے ہیں۔ اب تک ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں

کہ جو ملازمین کے حقوق ہمارے ذمے ہیں وہ پورے کرنا تو دور کی بات ہے ہم نے تو آج تک یہ غور بھی نہیں کیا کہ یہ مسئلہ کتنا گھمبیر ہو چکا ہے۔ایک طرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے غلط عادات یا رواج کی وجہ سے نوکروں پر بے انتہا انحصار کرنا شروع کر دیا ہے اور دوسری طرف قوم کی آبادی کا ایک بڑا گھریلو حصہ ملازم پیشہ ہونے کی وجہ سے غلامی کی صورت میں زندگی گزار رہا ہے۔اس طبقے میں تعلیم، صحت، ترقی اور اچھی زندگی کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے۔ مالک اور ملازم دونوں ہی کسی نہ کسی صورت میں پس رہے ہیں اور ایک دوسرے سے سخت ناخوش ہیں اور اپنی اپنی تکالیف کا ذمہ دار ہر کوئی دوسرے کو ٹھہرا رہا ہے۔ یہ مسئلہ تبھی حل ہوگا اگر ہم سب مل کر یہ سوچ و بچار کریں کہ کس طرح اپنے طور طریقوں میں تبدیلی لا کر ہم زندگی زیادہ بھرپور انداز میں گزار سکتے ہیں اور ملازم رکھنے پر انحصار کم کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ گھریلو ملازمین ہمارے معاشرے میں ایک مسلسل مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔ملازمین رکھ کر ہم ایک ایسی صورت حال کا شکار ہو جاتے ہیں جس میں ہر کوئی نقصان میں ہے یعنی مالک کے لیے الگ مسائل ہیں اور ملازموں کے لیے الگ۔آیئے ان مسائل کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔گھریلو ملازم رکھ کر مالکان جن مشکلات سے گزرتے ہیں ان کے نتائج بعض اوقات تو فوری طور پر ظاہر ہو جاتے ہیں جبکہ بعض کے اثرات بڑے گہرے اور دور رس ہوتے ہیں۔اکثر ملازمین چھوٹی چھوٹی چوریوں سے شروع ہوتے ہیں اور پھر باقاعدہ پیشہ ور چور بن جاتے ہیں اور گھروں میں نوکریاں اس لیے کرتے ہیں کہ گھر کے بھیدی بن جائیں اور پھر جب مالکان موجود نہ ہوں تو بڑے پیمانے پر چوری ڈاکے اور بعض اوقات تو قتل جیسے بھیانک جرائم سے بھی باز نہیں آتے۔ایسے کئی واقعات ہم آئے دن اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں۔ایک اور بڑا نقصان جو ملازم رکھنے کے بدلے اٹھانا پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ گھر کی ہر بات ملازموں کو معلوم ہوتی ہے۔ ہر گھر میں ہر طرح کے مسائل ہوتے ہیں۔نوکروں کی بدولت ایک گھر کی بات دوسرے گھروں تک پہنچتی ہے جو کہ بڑی تکلیف دہ اور غیر مناسب سی بات لگتی ہے کہ آپ کیا کھاتے پیتے ہیں یا کرتے ہیں اس کی خبر سارے محلے کو ہو۔اس کے علاوہ ہمارے مذہب نے ہمیں پردے کی سہولت دی ہے یعنی مرد و عورت اپنے گھر کے اندر (جہاں کوئی نامحرم نہیں ہوتا) اپنی سہولت اور خواہش کے مطابق لباس پہن سکتے ہیں اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔بہر حال گھر سے باہر جاتے وقت یا گھر میں جب کوئی نامحرم آئے تب لباس ایسا ہونا چاہیئے جو مہذب اور پروقار ہو۔ جب ہم گھر میں ملازم رکھ لیتے ہیں تو ہم اس سہولت سے محروم ہو جاتے ہیں۔اپنے ہی گھر کے اندر ایک نامحرم انسان کے ہونے کا احساس ہمیں مشکل میں ڈالے رکھتا ہے۔غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ملازم نہ رکھنے سے جو آرام ملتا ہے وہ اس تکلیف سے بہت کم ہے جو نوکر رکھنے سے اٹھاتے ہیں۔ بے شمار نوکر رکھنے کا رواج ہمارے ہاں عورتوں کی جسمانی اور ذہنی صحت پر بری طرح اثر انداز ہو رہا ہے۔ہمارے ہاں وہ عورتیں جو گھروں میں رہتی ہیں

ان کی حالت پر ذرا غور کرنا چاہیئے۔

اس گروپ میں اونچے طبقے سے لے کر نچلے طبقے تک وہ سب خواتین شامل ہیں جو (So called) صرف گھروں کی ذمہ داریاں سنبھالتی ہیں۔ کہنے کو تو گھر سنبھالنا کافی مشکل کام ہے کہ اگر اسی کام کے لیے چھ سات مزید لوگوں کی مدد لی جا رہی ہو تو پھر اس کو گھر سنبھالنا تو نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے برعکس اس کے نوکروں کو سنبھالنا (جو کہ بذاتِ خود ایک مشکل کام ہے) کہہ لیں تو بہتر ہے۔

ایک ایسی ہی خاتون سے چند سال پہلے ملاقات ہوئی تو ہمیں بڑی تشویش ہوئی کہ یہ خاتون اپنا وقت کیسے گزارتی ہوگی۔ جب ان سے یہ دریافت کیا گیا تو وہ بڑی خوش ہوئیں کیونکہ ان کے خیال میں ان کے پاس بہت اچھا جواب موجود تھا بڑی خوشی سے بتانے لگیں بچوں اور میاں کو ناشتہ دے کر فارغ ہو جاتی ہوں تو کرنے کو کچھ نہیں ہوتا اس لیے میں سو جاتی ہوں دس بجے اٹھتی ہوں تو پھر کوئی کام نہیں ہوتا تیار ہو کر انڈین فلم لگا کر بیٹھ جاتی ہوں ساتھ ہی کام کرنے والی آ جاتی ہے اور وہ کام کرتی رہتی ہے' تین گھنٹے میں اس کا کام ختم ہوتا ہے اتنے ہی وقت میں میری فلم بھی ختم ہوتی ہے پھر بچے سکول سے آ جاتے ہیں ان کے ساتھ کھانا کھایا اور پھر کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تو میں ایک اور انڈین فلم دیکھ لیتی ہوں۔ شام تک جب میں بیٹھ بیٹھ کر تھک جاتی ہوں تو میں Walk کے لیے چلی جاتی ہوں پھر میاں صاحب آ جاتے ہیں رات کا کھانا ہم اکثر باہر ہی کھاتے ہیں۔ آپ یقین کریں گے مجھے کرنے کو کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس وقت تو حیرت سے ہمارا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا کہ اس خاتون کو خوش قسمت کہیں یا بدقسمت! لیکن وقت نے اس بات کا فیصلہ خود کر دیا چند سال کے اندر اندر یہ خاتون بے شمار بیماریوں کا شکار ہو گئی ہیں اور ڈاکٹرز نے انہیں فوری طور پر 70 پونڈ وزن کم کرنے کو کہا ہے نہیں تو ان کے ٹھیک ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام کو صرف اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ تو کہا گیا ہے کہ عورتوں کے لیے گھر کا کام فرض نہیں ہے بلکہ خاوند اس بات کا ذمہ دار ہے کہ چار دیواری کے اندر اسے ہر طرح کا آرام مہیا کرے لیکن دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس سہولت کی وجہ کیا ہے؟ یہ مقصد تو یقیناً نہیں ہوگا کہ عورتیں بیماریوں کا پہاڑ بن جائیں اور خاوند بچوں اور ارد گرد کے سب لوگوں کے لیے مسئلہ بنیں۔ بلکہ اس کا مقصد تو یہ تھا کہ گھر داری میں عورتیں اتنی الجھ نہ جائیں کہ علم نہ حاصل کر سکیں اور بچوں کی تربیت صحیح نہ کر سکیں۔ ہمارے ہاں لڑکی کو پڑھا لکھا سمجھ کر شادی کی جاتی ہے اور پھر گھر داری اور بچوں کی پرورش جیسی بھاری ذمہ داری اس کو سونپ دی جاتی ہے۔ لیکن اس کو یہ تربیت نہیں دی جاتی کہ اپنے حقوق و فرائض کی صحیح ادائیگی کے لیے اس کا مسلسل علم حاصل کرنا کتنا ضروری ہے۔ شاید اسی لیے علم حاصل کرنا ہر مرد اور عورت کے لیے فرض قرار دیا گیا۔ ایف اے' بی اے کرنا تو زندگی گزارنے کے لیے کافی نہیں ہے علم حاصل کرنا تو ایک مسلسل عمل ہے۔ جو زندگی کی

بدلتی ہوئی ضروریات کے ساتھ ساتھ سیکھنا پڑتا ہے۔مثلاً وہ ڈاکٹر جو (MBBS) کر کے لوگوں کا علاج شروع کر دے اور (MBBS) پر ہی ٹکا رہے اور اپنے شعبے میں مزید آگے نہ بڑھے تو اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے برعکس اس ڈاکٹر کی قابلیت کے جو علم کے لحاظ سے آگے ہو اور دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہو اس کی خبر رکھتا ہو۔یہی معاملہ ہر شعبے کے ساتھ ہے جو خواتین گھر سے باہر کام کرتی ہیں وہ تو پھر بھی کچھ نہ کچھ دیکھتی اور سیکھتی رہتی ہیں۔جبکہ جو خواتین گھروں میں رہتی ہیں وہ تو اخبار پڑھنے تک کی تکلیف گوارہ نہیں کرتیں بلکہ وہ اخبار خریدنا بھی فضول خرچی سمجھتی ہیں۔اکثر لوگوں کے گھر جا کر اخبار مانگو تو جواب یہ ملتا ہے کہ میاں صاحب تو دفتر جا کر پڑھ لیتے ہیں اور ہم نے پڑھ کر کیا کرنا ہے۔ ہانڈی روٹی کرنے کے لیے تو واقعی انہیں کسی بھی طرح کے اچھے برے کی تعلیم نہیں چاہیئے۔لیکن بچوں کی اچھی تربیت کرنے اور زندگی کسی اچھے مقصد کے لیے گزارنے کی تو ضرورت ہے۔گھر کے کام عورتوں پر اس لیے تھوپے گئے ہیں کہ وہ بالکل ہی بے کار نہ ہو جائیں اور جو تھوڑا بہت حصہ ان کے کام کا ہے اس سے بھی جائیں۔یہ ایک المیہ ہے کہ عورت کی قابلیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جائے کہ وہ کھانا کیسا پکاتی ہے یا گھر صاف رکھتی ہے کہ نہیں یا پھر اس کے سسرال والے اس عورت سے کتنے خوش ہیں۔جسے اللہ اور رسول ﷺ کے بعد احترام میں سب سے اونچا درجہ دیا گیا اور ماں کے قدموں کے نیچے جنت رکھی گئی۔اس کی قابلیت اس کے علم سے دیکھی جانی چاہیئے تاکہ وہ گھر کو مضبوطی سے سنبھال سکے' بچوں کی صحیح تربیت کر سکے اور ضرورت پڑنے پر باہر کے کاموں یہاں تک کہ مشکل وقت آئے تو کمانے تک میں خاوند کا ہاتھ بٹا سکے۔صرف اس صورت میں اس کا حق بنتا ہے کہ اگر ملازم ضروری سمجھے تو رکھے اور اپنی قابلیت کی بدولت اپنے خدمت گزاروں میں بھی علم کی روشنی بانٹے اور انہیں بہتر انسان بنائے۔اس عورت کو خدمت گزار رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے جو خود بے کار ہے۔اکثر عورتوں سے اگر پوچھیں کہ اتنے ملازم کیوں رکھے ہوئے ہیں تو جواب یہ ہوتا ہے کہ کام بہت ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ گھر چلانا واقعی ایک بہت مشکل کام ہے اور ہم نے غلط طرز زندگی سے اس کو اور بھی مشکل بنا لیا ہے۔آیئے جائزہ لیتے ہیں کہ ہم کس طرح اپنے گھروں کے کاموں میں تبدیلی لا کر نوکروں پر انحصار کم کر سکتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں عورت اور مرد کی ذمہ داریاں بہت غیر متوازن ہیں۔بچپن ہی سے کام کے معاملے میں لڑکے اور لڑکی میں فرق رکھا جاتا ہے۔لڑکوں کو یہ احساس رہتا ہے کہ گھر کی کوئی ذمہ داری ان پر نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے بڑوں کو بھی اسی طرح کرتے دیکھتے آئے ہیں کہ جیسے ہی باپ گھر میں داخل ہوتا ہے اس کے چائے پانی کا فوری انتظام کیا جاتا ہے اور اس کے آرام کی ہر چیز مہیا کی جاتی ہے اور یہ سلسلہ ہر حال میں یوں ہی جاری رہتا ہے چاہے وہ نوکری کرے یا نہ کرے۔جبکہ خواتین کے ساتھ یہ مسئلہ بالکل الٹ ہے۔ جب کوئی عورت نوکری سے یا پھر گھر کا کوئی کام نمٹا

کر واپس آتی ہے تو اسے پوچھنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا بلکہ وہ گھر آتے ہی گھر کے باقی لوگوں کی خاطر اور خدمت میں لگ جاتی ہے اور اس کا فرض سمجھا جاتا ہے۔ اب اس طرح کے حالات میں ملازموں کے بغیر گزارہ کرنا تو مشکل ہے حالانکہ اگر گھر کا کام یوں جمع نہ کیا جائے ہر کوئی اپنا کام سارا دن نمٹاتا رہے تو صورتِ حال بالکل مختلف ہوگی۔

ہمارے ہاں خواتین نے تو وقت کی ضرورت کے پیشِ نظر باہر کی ذمہ داریاں اٹھالیں لیکن مرد حضرات لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ہوتے ہیں کہ گھر کے کام ہم کیوں کریں حالانکہ خواتین تو اگر باہر کے کام نہ بھی کرنا چاہیں تو یہ حق ان کو حاصل ہے لیکن مرد حضرات کو یہ حق بالکل حاصل نہیں ہے کہ ذرا ذرا کام بھی خود نہ کر سکیں۔ اسی طرح کی صورت حال دیکھ کر بچے بھی سارا کام ماؤں پر ڈال دیتے ہیں۔ خاص طور پر لڑکوں میں یہ بیماری عام پائی جاتی ہے کہ گھر آتے ہی جوتے اتار کر کہیں پھینکیں گے اور موزے کہیں اور ماں یا بہنیں چیزیں اٹھاتی پھریں گی۔ یہی لڑکے جب بڑے ہوتے ہیں تو ان کا بس نہیں چلتا کہ نوکری بھی ان کی جگہ کوئی اور کر لے۔ یہ طرزِ زندگی بہت سے لوگوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ غور کریں تو معلوم ہوگا یہ طرزِ عمل نہایت بوسیدہ اور دقیانوسی ہے اور اس نے ملازموں کو ناگزیر بنا دیا ہے ہمارے ہاں چونکہ ابھی بھی خاندان اکٹھے ہو کر رہتے ہیں (Joint Family System) اور جب کئی خاندان اکٹھے رہیں اور ہر کوئی اپنا کام بھی نہ کرے تو گھر چلانا تو واقعی مشکل ہے۔ عزت واحترام کے پیشِ نظر اکثر لوگوں کو اس طرح کے رویئے سے روکا بھی نہیں جا سکتا۔ مجبوراً بے شمار ملازموں پر انحصار کرنا پڑتا ہے جب تک گھر کا ہر فرد چاہے وہ مرد ہو یا عورت بچہ ہو یا بزرگ اپنے اپنے کام کی ذمہ داری نہیں اٹھائے گا تو ایسے طرز زندگی کو بہتر نہیں کیا جا سکتا۔ گھر کا نظام ٹھیک نہ ہونے کی ایک اور وجہ جو دیکھنے میں آتی ہے وہ بے تکی مہمانداری ہے یعنی آپ کے گھر کوئی بھی کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔ اس صورت حال میں تو خاتون خانہ یہی چاہے گی کہ کسی طرح گھر کی صفائی' کھانا پکانا اور دوسرے سارے کام جلدی جلدی ہو جائیں کیونکہ کسی بھی وقت کوئی مہمان ٹپک سکتا ہے۔ مہذب قوموں کے یہ اطوار نہیں ہوتے۔ کسی کے گھر جانے سے پہلے نہ صرف اطلاع دی جاتی ہے بلکہ پوچھا جاتا ہے کہ آپ مصروف تو نہیں ہیں اور اگر دروازے تک جا کر بھی تین دفعہ دستک دینے کے بعد اگر گھر والے دروزاہ نہ کھولیں تو خاموشی سے واپس لوٹنا ہی مناسب سمجھا جاتا ہے۔ یہی اللہ کا فرمان ہے لیکن مسلمان قوم ہونے کے باوجود ہم اس سہولت سے محروم ہیں کیونکہ جب کوئی مہمان آ جائے تو تین بار کیا وہ تو دس بار بھی دستک دے گا' پھر دروازہ پیٹے گا اور کھڑا ہی رہے گا جب گھر والے تنگ آ کر دروازہ نہ کھول دیں۔ ایسی صورت میں تو ملازم مہمان کو اتنی دیر تک تو چائے پانی پوچھ سکتا ہے جتنا وقت میزبان کو اپنے ضروری کام بند کر کے آنے میں لگتا ہے۔ یہ طرزِ عمل نہ صرف نہایت غیر مناسب ہے بلکہ غیر اسلامی بھی ہے۔ ہمارا مذہب ایسے طرزِ زندگی کی اجازت نہیں دیتا جو دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث بنے۔ سب سے بڑی وجہ جو ملازمین رکھنے کی ہے

وہ ہمارے معاشرے میں کھانے پینے کے غلط طور طریقے ہیں۔حال ہی میں ہمارے ہاں فاسٹ فوڈ کلچر متعارف ہوا ہے جو کہ لوگوں میں بڑا مقبول بھی ہے لیکن ہمارے ہاں لوگ کیونکہ سوچ بچار ذرا کم کرتے ہیں اس لیے اس قسم کے کلچر کے پیچھے جو مقصد ہے اس سے وہ ناواقف ہیں۔دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں جہاں کام کرنے کی اہمیت کھانے پینے سے کہیں زیادہ سمجھی جاتی ہے وہاں فاسٹ فوڈ اس لیے بنایا اور اپنایا گیا کہ کم سے کم وقت میں اچھا اور سادہ کھانا مل سکے۔مغرب کی تقلید تو ہمارے ہاں شوق سے کی جاتی ہے جبکہ ہمارے مذہب نے بھی چودہ سو سال پہلے یہ بھی سکھانے کی کوشش کی تھی۔ ہمارے نبی پاک ﷺ کی پسندیدہ خوراک چھان کی روٹی اور پانی تھا۔آج کل دیکھا جائے تو مسلمان کھانے میں سب سے آگے نظر آتے ہیں اور ایک گوشت خور قوم کے طور پر جانے جاتے ہیں جبکہ ہمارے نبی ﷺ نے گوشت کو زیادہ پسند نہیں کیا۔ہمارے رسول پاک ﷺ کا طرزِ زندگی ایسا تھا کہ کئی کئی دن گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ آپ ﷺ کی زندگی اتنی سادہ تھی کہ اکثر دودھ اور کھجور پر گزارہ ہوتا۔مسلمان ہونے کے ناطے ہمیں بھی ایسا ہی سادہ اور آسان طریقہ اپنانا چاہیئے۔جبکہ ہمارے ہاں معاملہ بالکل الٹ ہے۔بڑے بڑے گھرانوں میں ایک دفعہ کا پکا ہوا کھانا دوسرے وقت نہیں کھایا جاتا بلکہ نوکروں کو دے دیا جاتا ہے۔روٹی بھی تازہ اور گرم گرم پسند کی جاتی ہے جبکہ یہ صحت کے لیے مضر ہے۔نوکروں پر انحصار کم کرنے کے لیے ہمیں اپنا طرزِ زندگی بدلنا ہوگا۔نہیں تو ہم ان قوموں سے بہت پیچھے رہتے چلے جائیں گے جنہوں نے کام کو زندگی کا مقصد بنا لیا ہے اور کھانے کی اہمیت صرف اتنی رہ گئی کہ یہ لوگ کام ادھورا چھوڑ کر کھانے کے لیے کبھی نہیں جاتے۔بلکہ چاکلیٹ جیب میں رکھتے ہیں اور ضرورت کے وقت کھا لیتے ہیں۔ یہ چاکلیٹ اور ٹافیاں وغیرہ انہوں نے بنائی ہی اسی مقصد کے لیے تھیں۔ہمارے پاس تو نبی پاک ﷺ کی سنت موجود ہے جس کی بہترین مثال کھجور ہے۔ایک ریسرچ کے مطابق ہم اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ کھانا کھانے میں گزار دیتے ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاتا کہ بعض حالات میں گھریلو ملازم کی ضرورت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔اگر ملازم رکھنا ہی پڑے تو ایسی تدابیر اختیار کرنی چاہیئے کہ اس معاملے میں کسی کی حق تلفی نہ ہونے پائے۔ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ ملازم کے بغیر گزارہ ممکن نہ ہو تو اس صورت میں ہمیں گھریلو ملازمین کے حقوق کے بارے میں مکمل آگاہی ہونی چاہیئے تاکہ کسی پر ظلم نہ ہونے پائے۔اس سلسلے میں ہم یہ جانتے ہیں کہ دن رات ساتھ رہنے والے گھریلو ملازمین کے حقوق بہت زیادہ ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو برابر بنایا ہے ہمیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم کسی کو کسی سے کم درجے کا انسان سمجھیں۔ہمارے ملازم بھی انسانیت کے حوالے سے ہمارے برابر کا درجہ رکھتے ہیں صرف ان کی ذمہ داریوں کی نوعیت میں فرق ہوتا ہے۔اس دنیا کے نظام کو چلانے کے لیے خدا نے درجے بنائے ہیں لیکن کوئی کام

ایسا نہیں ہوتا جو کسی انسان کو کم درجے کا انسان بنائے۔ بحیثیت انسان ملازم مالک کے برابر ہی ہے اور اسی عزت نفس اور سلوک کا مستحق ہے جو مالک کو اپنے لیے پسند ہے۔ اگر آپ اپنے ملازم کو اپنے ساتھ میز پر کھانا نہیں کھلا سکتے کیونکہ وہ آپ کی طرح تہذیب یافتہ نہیں ہے تو اس کے ذمہ دار سراسر آپ خود ہی ہیں۔ جو خدمت گزار آپ کی خدمت کے لیے 24 گھنٹے حاضر ہے اس کا یہ حق کہ آپ اسے اس قابل بنائیں کہ آپ گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھ سکیں اور آپ میز پر اس کے ساتھ کھانا کھائیں۔ اسے دنیا کے حالات سے باخبر رکھیں' اسے اس لیے بے خبر نہ رکھیں کہ وہ کہیں چلا نہ جائے کیونکہ آپ کو اس سلوک کا جواب خدا کو دینا ہے۔ بہر حال اس طرح کا رویہ جب کسی ملازم کے ساتھ رکھا جائے گا تو وہ اپنے حقوق سے خوب آگاہ رہے گا یا تو آپ کو اس کے وہ سارے بنیادی حقوق (جن کا ہر انسان برابر کا حق دار ہے) پورے کرنا پڑیں گے یا پھر اپنے کام خود کرنے کا اختیار آپ کو حاصل ہے یہ کام اچھا خاصا مشکل ہے۔ اس طریقہ کار کو اپنانے کا حتمی نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ معاشرہ اس مفلس طبقے سے پاک ہو جائے گا اور صحیح معنوں میں اسلامی معاشرہ تبھی وجود میں آ سکے گا۔

بچوں کو ملازم رکھنا تو ہر حال میں ناجائز ہے اور ایک ایسا گناہ ہے جس کی معافی ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ آپ اس کے ماں باپ کو چاہے کتنا کچھ دے دیں جو دکھ اور احساس کمتری اس بچے کے حصے میں آئے گی وہ اس کی شخصیت کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ اگر کسی کو اپنے چھوٹے بچوں کے لیے ذرا بڑی عمر کے بچے کی ضرورت ہے جو چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیل لے اور ان کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹا دے تو کسی غریب کے بچے کو گود لیا جا سکتا ہے اور اس سے صرف اتنا ہی کام لیا جا سکتا ہے۔ جو اگر آپ کے اپنے بچے ہوں تو آپ ان سے لیں گے۔ اس سلوک کو پرکھنے کا پیمانہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جب یہ بچہ آپ کے بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہو یا میز پر کھانا کھا رہا ہو اور آپ کے گھر کوئی مہمان آ جائے تو وہ فرق نہ بتا سکے کہ آپ کے بچے کون ہیں اور کون نہیں' اس بچے کا یہ حق ہے کہ اسے وہی خوراک تعلیم' رہن سہن اور تربیت دی جائے جو آپ کو اپنے بچوں کے لیے پسند ہے اور اس بات کا خاص طور پر دھیان رکھا جائے اور اسے ملازم نہ کہا جائے۔ رتی برابر فرق بھی خدا کے قہر کا باعث بن سکتا ہے۔ کیونکہ کوئی کتنا ہی امیر ہو کسی بچے کی معصومیت اور بچپن کی قیمت نہیں چکا سکتا۔ ہاں البتہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ اس بچے کو اتنا پیار اور خود اعتمادی دیں کہ آج جو مجبور ہو کر آپ کے گھر میں پڑا ہے اس قابل ہو جائے کہ اس کی اگلی نسلیں اس تباہی سے بچ سکیں اور آپ بھی خدا کے آگے سرخرو ہو جائیں۔ ملازم رکھنے کا سب سے محفوظ طریقہ (Part Time) ملازم رکھنا ہے۔ اس سلسلے میں اُجرت دیتے وقت اس بات کا دھیان رکھنا چاہیئے کہ کم از کم 130 روپے روزانہ سے کم اجرت انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ انسانی حقوق کے اداروں کے مطابق کم از کم 130 روپے اجرت (جو کہ ہمارے ہاں 130 روپے

کے)عوض آٹھ گھنٹے روزانہ سے کام زیادہ نہیں لیا جاسکتا۔اس سے اوپر جو کام لیا جائے وہ ڈیڑھ گنا اجرت پر لیا جائے۔ اس حساب سے وہ ملازم جو صبح 9 سے شام 5 بجے تک تیس دن کا کام کرے اس کی کم از کم اجرت 3600 روپے بنتی ہے اگر ایک ملازم کئی گھروں میں کام کرے تو ملا کر کم از کم اتنا ہی ہونا چاہیئے جو کہ ہمارے ہاں اس سے کہیں کم ہے۔جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ محنت سے کام نہیں کرتے اور پھر چوری وغیرہ کرنا بھی اپنا حق سمجھتے ہیں۔آٹھ گھنٹے نوکری کرنے کے بعد بھی یہ ملازمین تعلیم حاصل کر سکتے ہیں' کوئی دوسرا کام کر سکتے ہیں' کوئی ہنر سیکھ سکتے ہیں اور اس طرح آہستہ آہستہ اپنی زندگی کے معیار کو بلند کر سکتے ہیں۔(Part Time) ملازمین کو مہینے کی بجائے روزانہ یا پھر ہفتے کی اجرت دینی چاہیئے تا کہ وہ ساتھ ساتھ اپنی ضروریات کو پورا کر سکے اور اگر بہتر کام یا زیادہ اجرت مل رہی ہو تو مجبوری سے تنخواہ کے انتظار میں اسے مہینے بھر انتظار نہ کرنا پڑے۔ مالکان بھی بہتر کام کرنے والے کچھ تعلیم یافتہ اور محنت کرنے والے کو زیادہ اجرت دیں اس طرح آہستہ آہستہ ان لوگوں میں بہتری کا رجحان بڑھے گا اور نتیجتاً ان لوگوں کا معیار زندگی بھی بلند ہوگا۔غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ملازمین کو چاہے کسی بھی صورت میں رکھا جائے اور جب ان کے حقوق نہ صرف انسانی نقطہ نظر سے بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے بھی پورے کئے جائیں تو کافی محنت طلب اور مہنگا پڑتا ہے۔اس لیے کوشش کرنی چاہیئے کہ خود کام کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ جیسے جیسے اس طبقے میں اپنے حقوق کے بارے میں علم بڑھے گا (جو کہ ہر انسان کا بنیادی حق اور ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے) ان کی تعداد بتدریج کم ہوتی جائے گی کیونکہ گھروں میں لوگ صحیح اجرت نہیں دے پائیں گے اور یہ طبقہ ہنر مند ہو کر اور کام ڈھونڈے گا۔ہمارے معاشرے میں اس تبدیلی کے اثرات نمایاں ہو رہے ہیں اگر ہم نے اس تبدیلی کو مجبوری سے قبول کیا تو سنبھلنے میں دقت ہوگی جبکہ اگر ہم اس کو مثبت تبدیلی سمجھیں تو بڑی آسانی سے گھروں کے نظام کو بہتر کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ جو لوگ اپنے کام خود کرنے کو چھوٹے پن کی نشانی سمجھتے ہیں ان کو بتا دیا جائے کہ اپنے کام خود کرنا تو سنت نبوی ﷺ ہے۔چھوٹے تو وہ لوگ ہیں جو ہمارے مذہب اور نبی ﷺ کی سنت کو غلط سمجھتے ہیں اور جو لوگ نبی پاک ﷺ کی سنت کے پیروکار ہیں وہی اصل میں اس دنیا اور آخرت میں اجرِ عظیم کے مستحق ہیں۔اس مسئلے کے حل کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس طبقے کے حقوق کو اچھی طرح سمجھیں اور اپنے آپ کو یہ مہلت ہی نہ دیں کہ کوئی کوتاہی کی جائے۔کیونکہ حقوق العباد میں اگر ہم پورا نہ اُترے تو اس کی جو قیمت چکانا پڑے گی وہ بہت بھاری ہے اور کوئی اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔اس معاملے میں جو احکامات اور ہدایات ہمیں ہمارے پیارے نبی پاک ﷺ نے دیں ہمیں ان کا تفصیل سے جائزہ لینا چاہیئے اور ان پر سختی سے عمل کرنا چاہیئے۔مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ غلاموں کی غلطیوں اور قصور کو معاف کرنے کے سلسلے میں کیا احکام ہیں' حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور

عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ اپنے خادم اور غلام کی غلطیاں کس حد تک ہمیں معاف کر دینا چاہئیں؟ آپ ﷺ نے سکوت فرمایا (اور کوئی جواب نہیں دیا) اس شخص نے دوبارہ آپ ﷺ کی خدمت میں یہی عرض کیا آپ ﷺ پھر خاموش رہے اور جواب میں کچھ نہیں فرمایا پھر جب تیسری دفعہ اس نے عرض کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہر روز ستر دفعہ۔ (سنن ابوداؤد)

(تشریح) پہلی اور دوسری دفعہ جو آپ ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی اختیار فرمائی اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ آپ ﷺ نے سوال کرنے والے صاحب کو اپنی خاموشی سے یہ تاثر دینا چاہا کہ یہ کوئی پوچھنے کی بات نہیں ہے' اپنے زیرِ دست خادم اور غلام کا قصور معاف کر دینا تو ایک نیکی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور رحمت حاصل ہوتی ہے اس لیے جہاں تک ہو سکے معاف ہی کیا جائے۔ لیکن جب دو دفعہ کے بعد تیسری دفعہ بھی ان صاحب نے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا "کل یوم سبعین مرة" یعنی اگر بالفرض ہر روز صبح سے شام تک ستر قصور کرے تب بھی اسے معاف ہی کر دو۔ یہاں "سبعین" سے ستر کا خاص عدد مراد نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا زیر دست غلام یا نوکر بار بار غلطی اور قصور کرے تو انتقام نہ لو معاف ہی کر دو۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (وفات سے پہلے) جو آخری کلام فرمایا وہ یہ تھا:

" الصلٰوة الصلٰوة واتقو الله فيما ملكت ايمانكم " (یعنی نماز کی پابندی کرو' نماز کا اہتمام کرو اور اپنے غلاموں زیر دستوں کے بارے میں خدا سے ڈرو)۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس دنیا سے اور اُمت سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو خاص طور سے دو باتوں کی تاکید اور وصیت فرمائی تھی۔ ایک یہ کہ نماز کا پورا اہتمام کیا جائے اس میں غفلت اور کوتاہی نہ ہو۔ یہ سب سے اہم فریضہ اور بندوں پر اللہ کا سب سے بڑا حق ہے۔ دوسری یہ کہ غلاموں باندیوں کے ساتھ برتاؤ میں اس خداوند ذوالجلال سے ڈرا جائے جس کی عدالت میں ہر ایک کی پیشی ہوگی اور ہر مظلوم کے ظلم کا بدلہ دلوایا جائے گا۔ غلاموں زیر دستوں کے لیے یہ بات کتنے شرف کی ہے کہ نبی پاک ﷺ نے اس دنیا سے جاتے وقت سب سے آخری وصیت اللہ کے حق کے ساتھ ان کے حق کی ادائیگی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی فرمائی۔ اب ہم اس صورتحال سے اچھی طرح واقفیت حاصل کر چکے ہیں کہ یہ معاملہ کتنی گہرائی رکھتا ہے اور ملازم رکھنے کے کیا مسائل و اسلوب ہیں۔ اس کے بعد اب یہ ہم سب پر فرض ہے کہ مسئلے کو خوش اسلوبی سے حل کریں اور کسی کی حق

تلفی کئے بغیر اپنی زندگی آرام وسکون سے گزاریں۔

☆ _____ ☆

عورت کا مقام اور اس کے دائرہ کار کا تعلق

عورت کا صحیح مقام کیا ہے؟ اس کا دائرہ کار کیا ہے؟ قدرت نے اسے کیا ذمہ داریاں دیں ہیں؟ عورت اور مرد کی ذمہ داریاں ایک دوسرے سے مختلف کیوں ہیں؟ یہ وہ سب سوالات ہیں جو ہم سب کے ذہن میں گردش کرتے ہیں۔اس موضوع پر قرآن پاک واضح ہدایات کے علاوہ بے شمار احادیث کی روشنی میں علمائے دین نے عورت کے مقام کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن عورت کی حیثیت اسلام سے پہلے اتنی مسخ ہو چکی تھی کہ بہترین ہدایات اور علم کے خزانوں کے باوجود یہ مسئلہ آج تک حل نہیں ہو سکا۔اس کی ایک چھوٹی سی مثال ایسے لے لیں کہ آج کا ایک عام فہم انسان یہ سمجھنے سے ابھی تک قاصر ہے کہ مرد کو چار شادیاں کرنے کی اجازت دے کر اللہ نے کس کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی ہے۔اسلام ہمیں جو زندگی گزارنے کی ترغیب دیتا ہے وہ صرف دنیاوی اور وقتی فائدے کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا نظام زندگی ہے جو ہر انسان کے لیے دائمی فائدے اور بہتری کا مرہون منت ہے۔مثلاً چار شادیوں کے مسئلے کو ہی لے لیں اول تو اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے شادیوں کی تعداد پر پابندی لگائی ہے۔اسلام سے پہلے جہالت کی یہ انتہا تھی کہ ایک آدمی سو بیویاں تک رکھتا تھا۔اسلام ایسی طرز زندگی کی سختی سے مذمت کرتا ہے۔جبکہ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عورت کی حیثیت کے بارے میں مغرب کی حالت یہ تھی کہ 1850 تک قانون کے مطابق ایک مرد اپنی بیوی کو بیچ سکتا تھا اور 586AD میں (جبکہ ہمارے نبی پاک ﷺ کی ولادت 571AD میں ہوئی) فرانس میں ایک (Convention) منعقد ہوا جس میں یہ موضوع زیرِ بحث آیا کہ عورت انسان ہے کہ نہیں اور اس کے نتیجے میں یہ فیصلہ ہوا کہ عورت انسان تو ہے لیکن صرف آدمی کی خدمت کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہ مغرب کی تہذیب ہے جس نے عورت کے تقدس کا حشر کیا ہے اور پھر ان کی یہ جرأت کہ اسلام کو ایک ایسا مذہب قرار دیتے ہیں جو عورتوں کو کم تر بناتا ہے۔بحیثیت مسلمان ہمارا فرض بنتا ہے کہ صحیح علم حاصل کر کے دنیا کو بتا دیں کہ اصلیت یہ ہے کہ صرف اسلام وہ مذہب ہے جس نے ماں کے قدموں کے نیچے جنت کا اعلان کیا ہے۔ اسلام کے دانشوروں نے مغرب کے تصور کو غلط قرار دیتے ہوئے اس مسئلے پر بہت محنت کی ہے اور بہت کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں ایک کتاب جو بہترین قرار پائی ہے وہ (مصطفےٰ السبانی) کی ہے جو کہ اردن میں اسلامی قانون کے پروفیسر تھے۔ان کی اس کتاب کے حوالے سے قرآن اور احادیث کی روشنی میں ہم دیکھیں گے کہ عورت کی حیثیت اور مقام کیا ہے؟ یہ تو ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسان کو خدا نے بہترین مخلوق قرار دیا ہے اور

فرشتوں سے سجدہ کروایا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے:

'' ہم نے انسان کو بہتر طریقہ پر تخلیق کیا۔ '' (95: 4)

اس تصور کو تسلیم کر لینے کے بعد انسان (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) کو قدرتی طور پر وہ اونچا مقام حاصل ہے جو کسی اور مخلوق کے حصہ میں نہیں آیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان جو کہ مرد بھی ہو سکتا ہے اور عورت بھی' کے درجات بنائے اور واضع کر دیا کہ سربلندی وپستی کا معیار تقویٰ اور سیرت ہے۔

'' جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت' لیکن باایمان ہو تو ہم اسے یقیناً نہایت بہتر زندگی عطا فرمائے گے اور ان کے نیک اعمال کا بہتر بدلہ بھی انہیں ضرور ضرور دیں گے۔''

(16: 97)

اور عورت اور مرد کی برابری عمل وجزاء سے واضع کرنے کے لیے رب العزت کا فرمان ہے۔

'' بلاشبہ مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اہل ایمان مرد اور اہل ایمان عورتیں عبادت کرنے والے مرد اور عبادت کرنے والی عورتیں' صابر مرد اور صابر عورتیں' شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں' صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور اللہ تعالیٰ کو زیادہ یاد کرنے والے مرد اور اللہ تعالیٰ کو زیادہ یاد کرنے والی عورتیں اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم تیار کیا ہے۔ '' (33: 35)

اس سے معلوم ہوا کہ خدا کے نزدیک تقویٰ اور آخرت کی کامیابی کا جو معیار مرد کے لیے ہے وہی معیار عورت کے لیے بھی ہے۔ نبی پاک ﷺ کی حدیث جو کہ '' احمد ابوداؤد'' نے لکھی ہے مزید مرد اور عورت کی برابری ظاہر کرتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ عورتیں آدمیوں کی بہنیں ہیں۔ اس کے بعد اس مسئلے کی مزید وضاحت درکار نہیں رہتی کہ بہن بھائی ایک ہی سلوک کے مستحق ہوتے ہیں۔ اسلام سے پہلے یہ تصور عام پیش کیا جاتا تھا کہ حضرت آدمؑ کو جنت سے باہر نکلوانے والی اماں حواؑ تھیں۔ اسلام اس طرح کے الزامات کو قطعاً رد کرتا ہے۔

'' پھر شیطان نے دونوں کو وہاں سے پھسلا دیا۔ '' (2: 6)

'' آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور بہک گیا۔ '' (20: 21)

قرآن پاک میں جہاں بھی اس واقعہ کا ذکر آیا ہے دونوں آدمؑ اور حواؑ قصوروار قرار دیئے گئے ہیں۔ بلکہ ایک مقام پر تو صرف حضرت آدمؑ کو ہی اس کا ذمہ دار ٹھہرا گیا ہے۔ ایسے اصول کو اسلام سرے سے رد کرتا ہے کہ کسی کے کئے کا بوجھ کسی دوسرے کے کندھوں پر ڈالا جائے۔ ایک اہم پہلو جو کہ عوتوں اور آدمیوں کی برابری کے سلسلے میں وضاحت

طلب ہے وہ اس دنیا کے بعد کی زندگی کے متعلق ہے۔ مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا آخرت پر یقین ہے۔ اس زندگی کے بارے میں جو بھی معلومات حاصل ہوں وہ ہمارے لیے بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن پاک نے بہت سے مقامات پر جنت کی خوبصورتی اور وہاں رہنے والوں کو جو انعامات ملیں گے ان کا ذکر کیا ہے۔ ان تمام چیزوں کی سچائی سے ہم کسی صورت انکار نہیں کر سکتے لیکن نبی پاک ﷺ کی ایک حدیث کی روشنی میں ہمیں مزید وضاحت ملے گی جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں جو کچھ ہے وہ کسی نے دیکھا نہ سنا۔ یہاں تک کہ انسانی سوچ وہاں تک پہنچ نہیں سکتی۔ اب قرآن پاک میں اللہ کے فرمان کی حضور پاک ﷺ کی حدیث کی روشنی میں وضاحت یوں ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کا ذکر کیا ہے جو انسان کی سمجھ اور تجربے کے مطابق ان کی دسترس میں ہیں۔ جبکہ اصل میں جنت کی زندگی ایک انسان کی سوچ سے بھی بالاتر ہے۔ یعنی وہاں کی خوبصورتی اور انعامات جو جنت میں داخل ہونے والوں کو ملیں گے وہ کوئی انسان تصور ہی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا آخرت کی زندگی میں کس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اس کی تفصیل اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اس نے انسان کے فطری تجسس کو پورا کرنے کے لیے جو کچھ ہمیں بتایا ہے اس پر یقین کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ جنت میں ہر آدمی کو ستر ستر حوریں ملیں گی تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ وہ کون عورتیں ہوں گی اور جو عورتیں جنت میں جائیں گی کیا انہیں بھی کچھ ملے گا؟

جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سات یا ستر کا لفظ عربی زبان میں زیادہ کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اسی طرح جہاں قرآن پاک میں انعامات کا ذکر کیا گیا ہے تو آدمی سے مراد صرف مرد نہیں ہیں بلکہ جو کچھ بھی ہے مرد و عورت کے لیے ہی ہے۔ عربی زبان میں بھی کئی اور زبانوں کی طرح مذکر کا صیغہ صرف مرد کے لیے نہیں بلکہ اکثر اوقات مذکر اور مونث دونوں کو ظاہر کرتا ہے۔ اس مسئلے کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ جنت کو پُرکشش بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کو وہ مثال دی ہے جس میں ان کے لئے کشش ہے۔ اپنی ریسرچ کے دوران ہم نے بہت سی خواتین سے پوچھا کہ کیا آپ بھی جنت میں ستر خوبرو آدمیوں کی خواہش مند ہیں تو وہ کانوں کو ہاتھ لگاتی ہیں کہ جنت کو جنت ہی رہنے دیں۔ شکر ہے اللہ تعالیٰ جس نے خواتین کو یقیناً ان کی خواہش کے مطابق بہت کچھ دینے کا وعدہ کیا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اگر اپنے بندوں کا پاسبان ہے تو گلہ کس بات کا؟ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

> ''وہ اللہ کی طرف رجوع کرنے والے' اس کی عبادت کرنے والے' اس کی حمد و ثنا کرنے والے' روزہ رکھنے والے' اس کے سامنے رکوع اور سجدہ کرنے والے' بھلائی کا حکم دینے والے اور برائیوں سے روکنے والے اور حدود اللہ کی حفاظت کرنے والے اور مومنوں کو خوشخبری دو۔'' (9: 112)

لہٰذا جنت میں کسی کو کیا ملے گا اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ جنت میں داخل کون ہوگا۔ اس میں کسی قسم کا کوئی شک

نہیں ہے۔ کہ انسان چاہے مرد ہو یا عورت اسکا حساب اس کے اعمال دیکھ کر کیا جائے گا اور اچھے کام کرنے والے مرد اور عورت ہی جنت میں جائیں گے۔ آدمی اور عورت کی برابری کے سلسلے میں ایک بنیادی مسئلہ درجہ بندی کا ہے۔

'' مرد عورتوں پر قوام ہیں اس لیے خدا نے بعض کو بعض سے (درجے میں) افضل بنایا ہے اور اس لیے بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ '' (9: 112)

قرآن پاک کے واضح احکامات کے باوجود انسان نے اپنے فائدے کے لیے طرح طرح کے مطلب نکال لیے ہیں۔ ذرا سا غور کرنے پر یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہ درجہ بندی قطعاً انسانیت کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ بحیثیت انسان مرد و عورت برابر درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن دنیا کا نظام چلانے کے لیے درجے بتائے گئے ہیں۔ جس طرح ایک دفتر میں دو (Boss) نہیں ہو سکتے اسی طرح اس دنیا کے نظام کو چلانے کے لیے ضروری ہے کہ ہر انسان اپنی اپنی جگہ پہچان کر اپنے دائرہ کار کا تعین کرے۔

کسی بھی ادارے میں جو سب سے اونچے درجے پر فائز ہوتا ہے۔ اس کی ذمہ داریاں بھی سب سے بڑھ کر ہوتی ہیں اور وہ اپنے سے نیچے والے سب لوگوں کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ چاہے یہ ادارہ گھر یا ملک یا پھر ایک پوری قوم یعنی اس امتیاز کو لے کر ایک انسان پر بھاری ذمہ داری ڈال دی جاتی ہے۔ اور صرف وہ لوگ کامیاب ہو پاتے ہیں جو اپنا وجود ختم کر کے دوسرے لوگوں کے لیے زندگی گزارتے ہیں۔ اندازہ لگائیے کہ آدمی کو ایک درجہ بلند عطا کر کے قدرت نے کون سا ایسا فائدہ دیا ہے جس سے عورتیں محروم ہیں۔ اس درجہ بندی کو اچھی طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے معاشرہ عجیب کشمکش کا شکار ہے۔ عورتیں وہ سب کام کرنے پر بھی مجبور ہیں جو ایک درجہ بلند رکھنے والے انسان کے لیے مخصوص کئے گئے تھے اور ساتھ ساتھ کم درجہ انسان کا بوجھ بھی اٹھائے ہوتی ہیں اور اس طرح بظاہر پستی کے پہیے میں بری طرح پس رہی ہیں۔ عورت ہونے کا الزام اس کی پیدائش سے شروع ہو جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں اس کا آغاز باقاعدہ تشہیر کے ساتھ کیا جاتا ہے کیونکہ لڑکے کے پیدا ہوتے ہی موقع پر مٹھائی بانٹی جاتی ہے اور لوگ مبارک دینے آتے ہیں جبکہ لڑکی پیدا ہونے پر مٹھائی نہیں بانٹی جاتی اور لوگ افسوس کرنے آ جاتے ہیں یا پھر ناراضگی کے اظہار کے لیے خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ سلسلہ اس طرف چل پڑتا ہے جو آگے چل کر بے شمار معاشرتی خرابیوں کی وجہ بنتا ہے۔ مثلاً اس احساسِ غلطی سے مجبور ہو کر ماں باپ لڑکی کی تعلیم و تربیت پر توجہ دینے کی بجائے اس کی شادی کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ پھر بے شمار جہیز دے کر لوگوں کو خوش کیا جاتا ہے۔ تاکہ کوئی نہ کوئی اچھا رشتہ مل جائے۔ لڑکے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ لڑکا ہے چاہے نالائق نکما، بداخلاق، مذہبی علم سے عاری ہو اسے اچھا رشتہ مل ہی جاتا ہے۔ دوسری طرف لڑکیاں معاشرے میں اپنی حیثیت اونچی کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے اپناتی

ہیں۔ظلم کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔عورت ایک طویل عرصے سے مظلوم چلی آ رہی تھی۔جدید دور میں جہاں زندگی کے بہت سے میدانوں میں انقلاب آیا۔تو وہاں عورت کی سماجی حیثیت بھی بدل گئی ہے۔ روایت ہے کہ کسی انسان کو اگر کوئی لقب دیا جائے تو وہ وہی بن جاتا ہے۔عورت ذات کے ساتھ بھی یہ معاملہ پیش آیا ہے کہ چاروں طرف سے سماجی دباؤ میں آ کر عورت نے اپنا مقام کھو دیا۔بجائے اس کے کہ وہ صحیح علم حاصل کر کے اعتماد کے ساتھ اچھی زندگی گزارتی' احساس کمتری کا شکار ہو کر عورت نے اپنی بہتری معاشرے کے ہاتھ میں سونپ دی ہے۔غور کیا جائے تو ہمارے معاشرے کی حالت اس عرب سے کوئی زیادہ مختلف نہیں ہے۔جس میں عورت کی نیلامی گائے بھینسوں کی طرح کی جاتی تھی۔اب تو لڑکیوں کو بنا سجا کر محفلوں میں لے جایا جاتا ہے تا کہ رشتے مل سکیں۔زمانہ جہالت میں بچی کو زندہ دفنا دیا جاتا تھا اور آج لڑکی کو بڑے شاہانہ انداز میں علم کے زیور سے آراستہ کرنے کی بجائے سونے چاندی میں لپیٹ کر دوسرے کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔عورت احساس کمتری کی وجہ سے سب کچھ ہنسی خوشی قبول کرتی رہتی ہے۔ایک لڑکی پہلے اپنے گھر میں بھائی کے مقابلے سے نقصان میں رہتی ہے اور سوچتی ہے کہ شادی کے بعد میری زندگی بہتر ہو سکے گی۔جبکہ شادی کے بعد نہ صرف شوہر بلکہ شوہر کے تمام رشتہ داروں کو خوش رکھنا اس کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔کبھی قربانی دے کر' کبھی سج بن کر اور اکثر وہ کام کر کے جو معاشرہ اس سے کروانا چاہتا ہے۔عورت اپنی کمزور حیثیت برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور ہر طرف سے گھاٹے میں رہتی ہے۔بہتر یہ ہوگا کہ عورت جان لے کہ وہ آدمی سے کمتر نہیں ہے۔ہاں اگر کوئی کمی ہے تو علم کی کمی ہے۔عورت کو اپنی حیثیت کا ہی صحیح علم نہیں ہے کیونکہ اگر اُسے اپنی صحیح حیثیت کا علم ہو جائے تو نہ وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے اپنا لباس خراب کرتی اور نہ ہی نمائش کی چیز بنتی۔

عورت ذات نے اپنی ساری قوتیں آدمی سے اپنی حیثیت منوانے میں یا پھر مرد حضرات کو خوش کرنے میں لگا دیں ہیں۔یعنی ہمارے معاشرے میں زیادہ تر دو طرح کی خواتین نظر آتی ہیں۔ایک طرف وہ ہیں جو گھر کی چار دیواری میں بند علم سے عاری اپنے خاوند کی بے جا خدمت میں لگی رہتی ہیں اور دوسری طرف وہ عورتیں ہیں جو باغی ہو کر گھر سے نکلیں اور مرد حضرات کے خلاف جنگ میں شامل ہو گئی ہیں۔دونوں طبقے اپنی اپنی جگہ غلط ہیں صحیح اسلامی نقطہ نظر میں عورت مرد کے برابر علم و عقل' معاشی استحکام' عزت و احترام اور مکمل انسانیت کی حقدار ہے اور اسے اپنی یہ حیثیت منوانے کے لیے کسی تائید یا حمایت کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اس کو صرف آگاہی کی ضرورت ہے کہ ہمارے مذہب نے اسے کیا حقوق دیئے ہیں اور اس کے کیا فرائض ہیں۔

اس کے فطری رجحانات کے مطابق وہ کون سا دائرہ عمل ہوگا جس میں ایک عورت مکمل آزادی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق اپنی حیثیت برقرار رکھ کر ان نعمتوں سے لطف اندوز ہو سکے جو اس کا حق ہے۔موجودہ دور کی

خواتین کو اپنی تمام تر توانائیاں علم کے حصول کے لیے وقف کر دینی چاہئیں۔ وہ جتنا زیادہ علم حاصل کریں گیں ان میں اتنی ہی علم و آگہی بڑھے گی اور انہیں اپنے حقوق و فرائض کا صحیح علم ہوگا نہیں تو دوسری طرف مرد اس بات کا فائدہ اٹھاتے رہیں گے کہ عورت اپنی حیثیت پہچانے بغیر ہی اس معاشرے کی خدمت میں لگی رہے۔

اس کی مثال اس طرح ہے کہ ہمارا واسطہ ایک ایسی خاتون سے پڑا کہ جن کے سسر نے انہیں قرآن پاک کے حوالے سے یہ بتایا تھا کہ شادی کے بعد دو مائیں اور دو باپ ہوتے ہیں یعنی جتنے حقوق تمہارے ماں باپ کے ہیں اتنے ہی خاوند کے ماں باپ کے ہونگے اور وہ خاتون کئی سالوں تک اسی کو سچ سمجھتی رہی۔ کیونکہ اس نے خود قرآن پاک صحیح طرح سمجھ کر نہیں پڑھا ہوا تھا۔ اس عورت کو یہ علم ہی نہیں تھا کہ ایسی کوئی تالیف قرآن پاک میں نہیں ہے جس میں کہا گیا ہو کہ شادی کے بعد دو دو ماں باپ ہوتے ہیں۔ پھر یہی وہ لوگ ہیں جو عورت کو کم عقل، کمزور اور نا جانے کیا کیا قرار دیتے ہیں حالانکہ ان سب باتوں کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انتہا تو یہ ہے کہ یہ دنیاوی زندگی تو ایک طرف کچھ لوگ تو یہ فرق آخرت تک لے جاتے ہیں۔

(۱) '' تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کر لی (اور فرمایا) کہ میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کرتا۔ تم ایک دوسرے کی جنس ہو تو جو لوگ میرے لیے وطن چھوڑ گئے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور لڑے اور قتل کئے گئے میں ان کے گناہ دور کر دوں گا اور ان کو بہشتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ (یہ) خدا کے ہاں سے بدلہ ہے اور خدا کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔ '' (3: 195)

(۲) '' اور جس چیز میں خدا نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہو اس کی حوس مت کرو۔ مردوں کو ان کاموں کا ثواب ہے جو انہوں نے کئے اور عورتوں کو ان کاموں کا ثواب ہے جو انہوں نے کئے اور خدا سے اس کا فضل و کرم مانگتے رہو کچھ شک نہیں خدا ہر چیز سے واقف ہے۔ '' (4: 32)

(۳) '' اور جو نیک کام کرے گا مرد ہو یا عورت اور وہ صاحب ایمان بھی ہوگا تو ایسے لوگ بہشت میں داخل ہونے اور ان کی تل برابر بھی حق تلفی نہ کی جائے گی۔'' (4: 124)

(۴) '' جو شخص نیک اعمال کرے گا مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہوا تو ہم اس کو (دنیا میں) پاک (اور آرام کی) زندگی سے رکھیں گے اور آخرت میں ان کے اعمال کا نہایت اچھا صلہ دیں گے۔ '' (16: 97)

مثلاً کہا جاتا ہے کہ عورت عبادت میں کبھی مرد سے بڑھ نہیں سکتی۔نفسیاتی نقطہ نظر سے اگر کسی کو یہ بتا دیا جائے کہ وہ امتحان میں جتنی بھی محنت کر لے اس کے نمبر اچھے پھر بھی نہیں آئیں گے کیونکہ سب سے اچھی پوزیشن پہلے ہی کسی کو دے دی گئی ہے پھر تو محنت کرنے کو دل نہیں چاہے گا۔ یہ سب من گھڑت باتیں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔عبادت سمیت دنیا میں کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں عورت چاہے اور مرد سے آگے نہ نکل سکے۔ بہر حال فطری تقاضوں کے پیش نظر وہ کچھ چیزوں میں آگے نکلنا ہی نہ چاہے تو اس کو اختیار ہے عورت کو جو بلند درجہ ہمارے مذہب نے دیا ہے اس کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ اسلام ہر اس انسان کے لیے خوشخبری کا پیغام لے کر آیا جس کی حیثیت ذات' کام اور جنس کے حوالے سے مسخ کی جا رہی ہے اور اسلام نے رنگ و نسل اور چھوٹے بڑے ہر فرق کو مٹا کر سب کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا اور صرف ایک پیمانہ مقرر کیا جو انسان کو افضل یا کمتر بناتا ہے اور وہ کردار ہے۔

بعض لوگ اپنی انا کی تسکین کی خاطر اس معاملے کو ہر طرح سے توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں اور گھما پھرا کر بات اس پر ختم کرتے ہیں کہ نہیں جی عورت مرد سے کمتر اور کمزور ہے۔ اتنی قرآنی شہادات کے بعد بھی اگر کوئی عورت کو برابر ماننے کو تیار نہ ہو تو فرمان الٰہی کا منکر ہوگا۔جن لوگوں کو یہ شکایات ہیں کہ عورت جسمانی یا ذہنی طور پر کمزور ہے تو انہیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ وہ سب مرد جنہوں نے دنیا میں بڑے بڑے کام کئے اور نام بنایا سب کو صرف عورت ہی نے پیدا کیا اور تربیت دی ہے۔ اگر عورت جسمانی یا ذہنی طور پر کسی طرح بھی کمزور ہوتی تو یہ ذمہ داری بھی خدا مرد حضرات کو ہی دے دیتا جبکہ ایسا نہیں ہے۔اندازہ لگایئے ان خواتین کا کیا ہوگا جنہوں نے حضرت عیسیٰؑ حضرت موسیٰؑ اور ہمارے پیارے نبی پاک ﷺ کو پیدا کیا۔ جب ہم عورتوں کو کم درجہ' کم عقل یا ان کے خلاف کچھ بھی الٹی سیدھی خرافات کہتے ہیں تو حقیقت میں ان کے اندر موجود صلاحیتوں سے انحراف کر رہے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت دونوں کو یکساں عطا کی ہیں اور یہ کہیں بھی واضح نہیں کہ بلند درجہ قابل اور باصلاحیت ہونے کے لیے مرد ہونا لازمی ہے یہ صرف ہماری غلط سوچ ہے جسے بدلنا بے حد ضروری ہے۔

یہ اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کہ بحیثیت انسان مرد و عورت ہر لحاظ سے برابر ہیں یہ جاننے کی اشد ضرورت ہوتی ہے کہ قدرت نے جو فطری فرق مرد اور عورت کی ذات میں رکھا ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ یہ فرق کس طرح نفسیاتی' ذہنی اور جسمانی لحاظ سے مرد و عورت کی شخصیت کی بنیاد بنتا ہے۔اگر ہم صرف مرد و عورت کو برابر برقرار دے کر سب مسائل حال کر سکتے تو مغرب میں یہ صورت حال نہ ہوتی کہ عورت کو برابری کا درجہ ملنے کے باوجود وہ مظلوم ہے۔مغرب کی عورت اس برابری کی بڑی بھاری قیمت چکا رہی ہے کیونکہ مرد نے اسے برابری کا درجہ دے کر

اپنی ذمہ داریاں تو کم کر ہی لی ہیں لیکن اس کے نتیجے میں عورت کو ان تمام سہولیات سے بھی محروم کر دیا ہے جو اس کا حق تھیں۔ اگر ہم چاہیں تو دوسروں کی غلطیوں سے بہت کچھ سیکھ کر یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کونسا راستہ ہوگا جو ان گمراہیوں سے بچ کر نکلنے کا ہے۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے کہ جس میں کسی بھی مسئلے کو ادھورا نہیں چھوڑا گیا۔ لہٰذا برابری کے باوجود مرد و عورت کے فطری فرق کے پیش نظر ان کے دائرہ کار کی وضاحت اور تعین بھی کر دیا گیا ہے تاکہ سب اپنی اپنی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے پورا کریں۔ البتہ اپنے فرائض اور حقوق پورے کرنے کے بعد انہیں یہ اختیار حاصل ہے کہ واضح کردہ دائرہ عمل اور بتائی گئی حدود کے اندر رہ کر اپنی زندگی بھرپور طریقے سے گزاریں۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرہ میں عورت کے لیے یہ کس طرح ممکن ہوگا کہ وہ اپنے فرائض اچھی طرح انجام دینے کے ساتھ ساتھ ایسی زندگی بھی گزار سکے جو اس کی خواہش اور مرضی کے مطابق ہوتا کہ وہ خوش رہ سکے۔ کیونکہ ایک عورت کی زندگی اور خوشی ہی ایک خوشحال گھرانے کی ضامن ہوتی ہے۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> ”جس کسی نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئیں۔ انگشت شہادت اور درمیانی انگلی سے آپ ﷺ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا (کہ جس طرح یہ دو انگلیاں ملی ہوئی) ہیں میں اور وہ جنت میں اس طرح داخل ہوں گے۔“ (مسلم)

اسی طرح ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ:

> ”جس شخص کے گھر لڑکی ہو اور وہ اسے زندہ درگور نہ کرے، نہ اس کے ساتھ حقارت آمیز سلوک کرے اور نہ اس پر اپنے لڑکے کو ترجیح دے تو اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔“

(ابوداؤد)

ان احادیث سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ لڑکیوں کی تربیت کو اتنی اہمیت دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑکیوں نے آگے چل کر بچوں کی پرورش کی بھاری ذمہ داری اٹھانی ہوتی ہے ایک عورت جیسی تربیت اپنی اولاد کی کرتی ہے وہ ویسے ہی انسان ہی بن کر معاشرے کا حصہ بن جاتے ہیں اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ دوسری اہم بات جو کہ ہمیں ان احادیث سے ملتی ہے وہ لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح نہ دینے کے بارے میں ہے۔ ترجیح سے مراد صرف برتری کا احساس ہی نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر معاملے میں دونوں کو برابر سمجھنے کے ہیں۔ یعنی ہر بچے کو علم و تعلیم، پیار و محبت اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں شروع ہی سے لڑکوں کو ہر معاملے میں ترجیح دی جاتی ہے

یہاں تک کہ بعض گھرانوں میں یہ امتیاز خوراک تک میں رکھا جاتا ہے۔لڑکیوں کی تعلیم صرف اچھے رشتے ملنے تک جاری رکھی جاتی ہے۔اس طرح کے سلوک کی ایک اہم وجہ جو دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ غلط اندازِ فکر ہے کہ شادی کے بعد لڑکی پر ماں باپ کا کوئی حق نہیں رہتا۔حالانکہ شادی چاہے لڑکے کی ہو یا لڑکی دونوں صورتوں میں ماں باپ کے حقوق برابر رہتے ہیں۔جبکہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ماں باپ اگر لڑکی کو پڑھا لکھا کر کسی بھی اچھے شعبے میں لگا دیں تو شادی کے بعد اس کی تنخواہ پر خاوند یا پھر سسرال والوں کا حق تو ہوتا ہے لیکن ماں باپ چاہے کتنے بھی ضرورت مند ہوں ان کا کوئی حق بیٹی پر نہیں سمجھا جاتا۔اس صورت حال کو دیکھ کر تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر کسی کے ہاں صرف لڑکیاں ہوں تو چاہے وہ اپنی لڑکیوں کو جتنا بھی پڑھا لیں ضرورت کے وقت وہ ان کے کام نہیں آسکیں گی۔

لہٰذا ماں باپ بھی لڑکیوں کی (فنی تعلیم) پر توجہ نہیں دیتے۔اس مسئلے کو حل کرنے کی ذمہ داری ان لڑکیوں پر ہے جو ڈاکٹر یا انجینئر تو بن جاتی ہے لیکن اپنے حقوق و فرائض سے بے خبر رہنے کی وجہ سے وہ طریقہ کار اختیار نہیں کرتیں جو اللہ اور رسول کی نظر میں بہتر ہو۔ ماں باپ لڑکیوں کی تربیت اگر صحیح طریقے پر کریں جو ہمارے مذہب کی بنیاد ہو تو آگے چل کر نہ صرف ان کو فائدہ ہوگا بلکہ شادی کے بعد بھی لڑکیاں اپنی انفرادی شخصیت کو برقرار رکھ سکیں گی۔ہمارے معاشرے میں لڑکیوں پر گھر کی ذمہ داری اتنی زیادہ ڈالی جاتی ہے کہ وہ بچپن سے بڑھاپے تک گھر کے کاموں میں بری طرح جکڑی رہتی ہیں۔محسوس ایسے ہوتا ہے کہ عورت انہی کاموں کے لیے بنائی گئی ہے جبکہ ایسا نہیں ہے؟ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے جنہوں نے انسانیت کو علم سے نوازا۔ہر انسان کو اس کا کام بتایا اور یہ بتایا کہ جو بھی اپنی ذمہ داری خوش اسلوبی سے پوری کرے گا اس کو انعام سے نوازا جائے گا۔اس معاملے میں ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ مرد و عورت برابر ہیں۔کام میں فرق ہوسکتا ہے لیکن ذمہ داری اور نظام دونوں کے لیے برابر رکھے گئے ہیں' ہر کوئی اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔

اسلام کے نقطہ نظر سے جو سوچ ہر کام کی بنیاد بننی چاہیئے وہ خوف خدا ہے۔ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی موجودگی کا احساس ہی انسان کو راہ راست پر رکھتا ہے۔جب کوئی انسان خدائے رب العزت کو خوش کرنے کے لیے کوئی کام کرتا ہے تو پرسکون رہتا ہے اور اصل خوشی کا حقدار بنتا ہے اس خوشی کا مقابلہ کسی اور خوشی سے نہیں کیا جاسکتا۔یہ خوف خدا کن لوگوں کو اور کیسے نصیب ہوتا ہے اس کا جواب ہمیں قرآن پاک کی آیت میں ملتا ہے۔

'' اللہ سے اُس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔ '' (35: 28)

یعنی علم خود خدا کا لازمی اور بنیادی جزو ہے۔بے شک جس کا علم زیادہ ہوگا وہ اچھے برے کی تمیز بھی زیادہ کرسکے گا اور اس طرح زیادہ خوف خدا کا متحمل ہوسکے گا اور یہ قرآنی آیات مرد و عورت دونوں کے لیے ہیں۔ لہٰذا کوئی بھی شخص

جو یہ سوچے کہ عورت اپنی ذمہ داریاں علم حاصل کئے بغیر نبھائے سراسر غلط ہے۔ چاہے ایک عورت گھر میں رہ کر ہی کام کرنا چاہے لیکن اس کی اپنی شخصیت اور بچوں کی تربیت کے لیے اس کا علم حاصل کرنا اشد ضروری ہے۔ ایک بے علم یا جاہل عورت ان سب ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی جو اللہ تعالیٰ نے اس کے ذمے لگائی ہیں۔ ذرا غور کریں کیا اس عورت کو گھر اور گھر کی عزت کا ذمہ دار بنایا جا سکتا ہے جو خوف خدا سے عاری ہو، ہرگز نہیں۔

ایک اور مسئلہ جس کی وضاحت ضروری ہے وہ گھر کے کام کرنے کے بارے میں ہے۔ اسلام نے باہر کے کاموں کی ذمہ داری عورت پر نہیں ڈالی بلکہ یہ آدمی کا کام ہے۔ عورت اپنی مرضی سے اس کی مدد کر سکتی ہے لیکن خاوند اسے کھانا پکانے، صفائی کرنے یا پھر گھر کے کسی بھی کام کا حکم نہیں دے سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو یہ حق دیا ہے کہ جو اس سے شادی کرے وہ گھر بنا کر ہر چیز مہیا کر کے دے اور بعد میں اس کی جائز ضروریات اور آرام مہیا کرے۔ نکاح کے ساتھ ہی خاوند پر حق مہر دینے سے لے کر بیوی کی ہر جائز ضرورت پوری کرنا، اپنا گھر، خوراک، لباس وغیرہ دینا جو خاوند کے معاشی حالات کے عین مطابق ہو، بیوی کا حق ہے۔ اس طرح بیوی کو جو پیسے گھر چلانے کے لیے ملیں وہ چاہے تو اپنے لیے ملازم رکھے یا اسے گھر کا کام کرنا پسند ہے تو خود کر لے۔ اگر وہ یہ دیکھے کہ پیسے کم ہیں اور وہ چاہنے کے باوجود ملازم نہیں رکھ سکتی تو اس صورت میں دونوں میاں بیوی مل کر گھر کا کام کریں اور اگر خاوند مصروفیت کی وجہ سے ہاتھ نہ بٹا سکے تو بیوی کا احسان مند رہے کہ وہ گھر چلا رہی ہے۔ کیونکہ گھر کے کام کرنا بیوی کی معاشی یا سماجی ذمہ داری تو ہو سکتی ہے لیکن اسلامی نقطہ نظر سے یہ اس کا فرض نہیں بنتا۔ اللہ کے فرمان کے مطابق جس طرح مرد پر علم حاصل کرنا فرض ہے اتنا ہی عورت پر بھی علم حاصل کرنا فرض ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایات ہے :

> ”انصار کی عورتیں کیا ہی خوب ہیں کہ دین کے معاملے میں فہم حاصل کرنے سے شرم و حیا ان کو باز نہیں رکھ سکتی۔“ (مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ”اللہ کی بندیوں کو مساجد سے نہ روکو اگر کسی کی عورت اس سے مسجد میں جانے کی اجازت طلب کرے تو منع نہ کرے۔“ (صحیح مسلم، مسند احمد)

حضرت عائشہؓ نبی پاک ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ

> ”تم اپنے گھروں میں جمی رہو کیونکہ یہی تمہارا جہاد ہے۔“ (مسند احمد)

ان دونوں روایات میں ظاہری اختلاف توجہ طلب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسجد کا ہمارے معاشرے میں ایک اہم مقام ہے۔ جس میں نہ صرف پانچ وقت کی نماز پڑھی جانی چاہئے بلکہ مسلمانوں کی زندگی کے ہر معاملے کے حل

کے لیے ہیڈ کوارٹر کی حیثیت رکھنا مسجد کا اصل مقام ہے۔ اب اگر پانچ دفعہ روزانہ نماز کے لیے جانا پڑے تو یقیناً گھر کا نظام متاثر ہوگا۔ جبکہ ان پانچ میں سے تین وقت اندھیرے کے بھی ہیں اس وقت عورت کا گھر سے نکلنا بھی نامناسب سا لگتا ہے۔ جہاں تک بات علم حاصل کرنے کی ہے اس کے لیے عورت کو مسجد جانے سے روکنے کا حق اسلام نے کسی کو نہیں دیا۔

اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کی ذاتی مثال ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ حضرت عمرؓ کی زوجہ حضرت عاطقہؓ مسجد جانے کی بہت شوقین تھیں جبکہ حضرت عمرؓ کو یہ پسند نہ تھا لیکن مجبور تھے منع نہیں کر سکتے تھے۔ صرف ناپسندیدگی کا اظہار کرتے تھے جس پر آپؓ کی زوجہ فرماتیں آپ منع کر دیں تو نہیں جاؤں گی۔ تمام عمر اسی طرح گزری یہاں تک کہ جب حضرت عمرؓ کو شہید کیا گیا تو حضرت عاطقہؓ مسجد میں موجود تھیں۔

اسلام کی دعوت کے لیے صحابہ اکرامؓ ہی (Role Models) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا:

'' میرے صحابہؓ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جس کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے۔ ''

(مشکوٰۃ)

ایک اور جگہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ درست طریقہ وہی ہے جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔

ازواج مطہرات اور صحابیات نے بھی اور آپ ﷺ اور صحابہؓ نے بھی ہاتھوں سے کام کرنے کو عظمت سمجھا۔ جب حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ نبی پاک ﷺ جب گھر میں ہوتے تو کیا کرتے تھے۔ تو حضرت عائشہؓ نے بتایا کہ

'' گھر کے کام کرتے تھے (اپنے اہل وعیال کے کام) اور جیسے ہی آذان ہوتی تو کام چھوڑ کر مسجد روانہ ہو جاتے تھے۔ '' (بخاری)

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کہیں بھی گھر کے کام کرنے میں عورتوں کو کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ اس کے برعکس علم حاصل کرنا اور تبلیغ کا کام عورتوں پر بھی اتنا ہی لازمی ہے جتنا مردوں پر۔ اس لیے گھر کا کام اتنا ہی کافی ہے جس سے فرائض کی ادائیگی میں حرج نہ ہو۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

'' مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی یقیناً اللہ سب پر حکیم و دانا ہے۔''

(9 :

بہرحال جب ذمہ داریاں بانٹی جائیں تو یہ خیال رکھنا پڑے گا کہ ہمارے مذہب نے اس سلسلے میں ہمیں کیا ہدایات دی ہیں۔ایک بار حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان اس بات پر جھگڑا ہو گیا تو نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ حضرت فاطمہؓ گھر کے اندر کی ذمہ داری سنبھالیں اور حضرت علیؓ کو گھر سے باہر کی ذمہ داری سنبھالنے کا حکم دیا۔ چونکہ گھر میں خاوند کی حیثیت نگران اور سربراہ کی ہے اس لیے مجموعی طور پر گھر کی ذمہ داری اس پر زیادہ ہے۔آج کل جو صورت حال دیکھنے میں آئی ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ مہنگائی زیادہ اور زندگی کی ضروریات بڑھ جانے کی وجہ سے عورتیں بھی کام کرنے پر مجبور ہیں۔لیکن اس کے باوجود ان پر نہ صرف گھر کی پوری ذمہ داری بلکہ یہاں تک کہ پورے سسرال کی ذمہ داری بھی ڈال دی جاتی ہے اور یہ سب وہ اپنا فرض سمجھ کر پورا کرتی ہیں۔اگر وہ گلہ کریں تو سب سے پہلے اس کی نوکری کی شامت آتی ہے۔اس طرح کی صورت حال میں گھر کا سکون برباد ہو جاتا ہے۔عورت چونکہ اپنی ہمت سے زیادہ بوجھ اٹھا لیتی ہے۔اس کے نتیجے میں اس کے رویے میں چڑچڑاپن آ جاتا ہے۔گھر میں چار پیسے تو زیادہ آ جاتے ہیں لیکن پورے خاندان کو اس کی بھاری قیمت چکانا پڑتی ہے۔ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ مغرب کی نقل کر کے ہم نے زندگی کا طریقہ تو بدل لیا لیکن سوچ نہیں بدلی۔جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ گھر نظر نہیں آتے جہاں گھر کا مالک سارا دن محنت کر کے شام کو لوٹے تو اسے ایک ہنستی مسکراتی خوش مزاج بیوی دروازے پر ملے۔ جبکہ ہمارے نبی پاک ﷺ نے فرمایا:

'' بہترین بیوی وہ ہے جسے جب دیکھو تو دل خوش ہو جائے۔ '' (طبرانی)

اس طرح کی صورتِ حال کا ہماری نئی نسل کی تربیت پر بہت بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ بچوں سے یہ اُمید کرنا ہی غلط ہوگا کہ وہ ایسے گھرانوں میں پرورش پا کر اچھے انسان بن سکیں گے۔جب تک ہم وہ طرزِ زندگی اختیار نہیں کریں گے جو ہمارے مذہب نے ہمیں دیا ہے ہماری کوشش اچھے نتائج کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

اسلام مالی امور کے سلسلے میں حدودِ شریعت کے اندر رہتے ہوئے عورت اور مرد کو دوڑ دھوپ کی اجازت دیتا ہے اور ان کی محنت کے صلہ کو ان کا جائز حق تسلیم کرتا ہے۔جس پر قانوناً کوئی بھی شخص دست درازی نہیں کر سکتا۔حتیٰ کہ خاوند بھی بیوی کے مال میں تصرف کا مجاز نہیں ہے اور نہ ہی یہ بیوی کے لیے جائز ہے کہ شوہر کی دولت میں اپنی مرضی نافذ کرے۔

'' مردوں کو اپنی کمائی کا حصہ ہے اور عورتوں کو اپنی کمائی کا حصہ ہے اور (دونوں) اللہ سے اس کا فضل مانگو۔ '' (4: 32)

قرآن پاک میں اللہ کے فرمان کے بعد کوئی وجہ نہیں ہونی چاہیئے کہ یہ مسئلہ اس شدت کے ساتھ ہمارے معاشرے میں اثر انداز ہو۔لیکن صورت حال اس کے برعکس ہے۔اندازہ لگایئے کہ ایک شادی کے دوران عورتیں بیٹھی جہیز کا حساب لگا رہی تھیں تو لڑکی کے سسرال میں سے ایک خاتون بڑی خوشی کے ساتھ بتانے لگیں کہ لڑکی کے ماں باپ کار کے حادثے میں مر چکے ہیں اور اب سسرال والوں کو جائیداد کے لیے لمبے عرصے تک انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔اس طرح کی سوچ صرف ان لوگوں کی ہی ہوسکتی ہے جو خوف خدا نہیں رکھتے اور ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں کہ علم کے بغیر خدا خوفی پیدا نہیں ہوسکتی۔ہم اس طرح کے لوگوں کو تو بدل نہیں سکتے' یہ لوگ اللہ کے احکامات کے منحرف ہیں وہی ان کا حساب کرے گا۔لیکن ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ علم حاصل کر کے اس قابل ہو جائیں کہ اس طرح کے لوگوں سے بچ سکیں۔

عورت کا حقیقی دائرہ کار مرتب کرنے کے لیے جن بنیادی باتوں کو پیش نظر رکھنا پڑے گا وہ کچھ اسطرح ہیں:

☆ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہترین مخلوق قرار دیا ہے چاہے وہ مرد ہو یا کہ عورت!

☆ انسانیت کا معیار صرف اور صرف ایمان اور کردار پر ہے اور یہ پیمانہ عورت اور مرد کے لیے برابر ہے۔

☆ خدا خوفی انسان کو باکردار بناتی ہے اور خدا خوفی علم ہی سے آتی ہے۔

☆ گھر چلانے میں مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ وہ اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

☆ وقت کی ضرورت کے پیش نظر جب عورتوں کو گھر سے نکلنا پڑے تو اس کے منفی اثرات سے بچنے کے لیے میاں بیوی کو مل بیٹھ کر یہ سوچنا چاہیئے کہ اس صورتِ حال سے کیسے نمٹا جائے۔

☆ ضرورت کے تحت عورت کو گھر سے نکلنے کی سہولت ہے۔حضرت عائشہؓ احکام حجاب کے نزول ہونے کے بعد واقعہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت سودہؓ کو باہر دیکھ کر تنقید کی تو وہ خاموش ہو کر واپس گھر آ گئیں اور رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا۔اس کے فوراً بعد آنحضرت ﷺ پر نزول وحی کی کیفیت طاری ہوگئی جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ'' بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہیں ضرورت کے تحت گھر سے نکلنے کی اجازت دی ہے۔'' (بخاری' مسند احمد)

☆ عورت کو ضرورت کے تحت گھر سے نکلنے کی اجازت ہے لیکن اگر اس کی بنیادی ضروریات گھر میں رہ کر پوری ہو جائیں تو بلاوجہ گھر سے نکلنے سے گریز کرنا چاہیئے۔عورت کا فائدہ بھی اسی میں ہے۔اس طرح وہ زیادہ تعمیری کاموں میں وقت صرف کر سکتی ہے۔

☆ جب عورت کو باہر جانا ہی پڑے تو پُر وقار طریقے سے تیار ہو کر جائے۔ قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

" اور اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور اگلے دورِ جاہلیت کی طرح زیب و زینت کا اظہار نہ کرتی پھرو۔ "

(33: 33)

☆ عورت کی کمائی ہوئی دولت یا پھر لائی ہوئی دولت پر صرف عورت کا ہی حق ہے۔ مرد کی کمائی میں عورت کا حصہ ضرور ہے اور جائیداد میں بھی لیکن عورت کی کمائی میں مرد کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ہاں اپنی مرضی سے وہ جسے جو چاہے دے سکتی ہے۔ جہاں تک عورت کی جائیداد میں خاوند کا حق ہے اس کے لیے قرآن پاک میں سورۃ النساء آیت نمبر 12 سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وصیت اور فرض پورا ہونے کے بعد اگر اولاد نہ ہو تو خاوند کا حصہ نصف اور اگر اولاد ہو تو ترکے میں خاوند کا حصہ ایک چوتھائی ہے۔

☆ اس کے علاوہ حق مہر لڑکی کے تحفے، تحائف (جو کہ عام طور پر شادی پر ملتے ہیں یا پھر کسی بھی جہیز کی چیز) پر لڑکی کے علاوہ کسی کا حق نہیں ہوتا۔

ذرا غور کریں تو معلوم ہو گا کہ اسلام کس طرح عورت کی کفالت اور حفاظت کا انتظام کرتا ہے۔ ہمارے مذہب میں عورت کو بے شمار آرام اور تحفظ دیا گیا ہے اور اس کے دائرۂ عمل کا رخ گھر کی طرف موڑا ہے۔

اس طرح کا طرزِ زندگی مہیا کر کے اسلام نے عورت کو جو مقام دیا ہے اس کا اندازہ اس روایت سے لگائیں کہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ کے زمانے میں ہم اپنی عورتوں سے گفتگو کرتے اور بے تکلفی برتتے ہوئے بھی ڈرتے تھے کہ کہیں ہمارے متعلق کوئی حکم نہ نازل ہو جائے۔ جب نبی پاک ﷺ کا انتقال ہو گیا تو ہم ان کے ساتھ بے تکلف رہنے لگے۔ ہمارے معاشرے میں اگر عورت کی معاشی، ذہنی اور جذباتی ضروریات عین اسلامی نقطۂ نظر سے پوری کی جائیں اور عورتوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی جائے تو وہ یقیناً پرسکون زندگی گزار سکیں گی۔ کیونکہ اسلام نے جو حیثیت اور مقام عورت کو دیا ہے اور جو دائرہ کار اس کے لیے وضع کیا ہے وہ عورت کی فطرت کے عین مطابق ہے اور ایک پرسکون معاشرے کی بنیاد بھی۔

☆ _____ ☆